راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیر اہتمام مسلسل اشاعت کا 19 واں سال

ماہنامہ ارژنگ لاہور

Monthly Arxang Lahore

مدیر اعلیٰ: عامر بن علی

مدیر: حسن عباسی

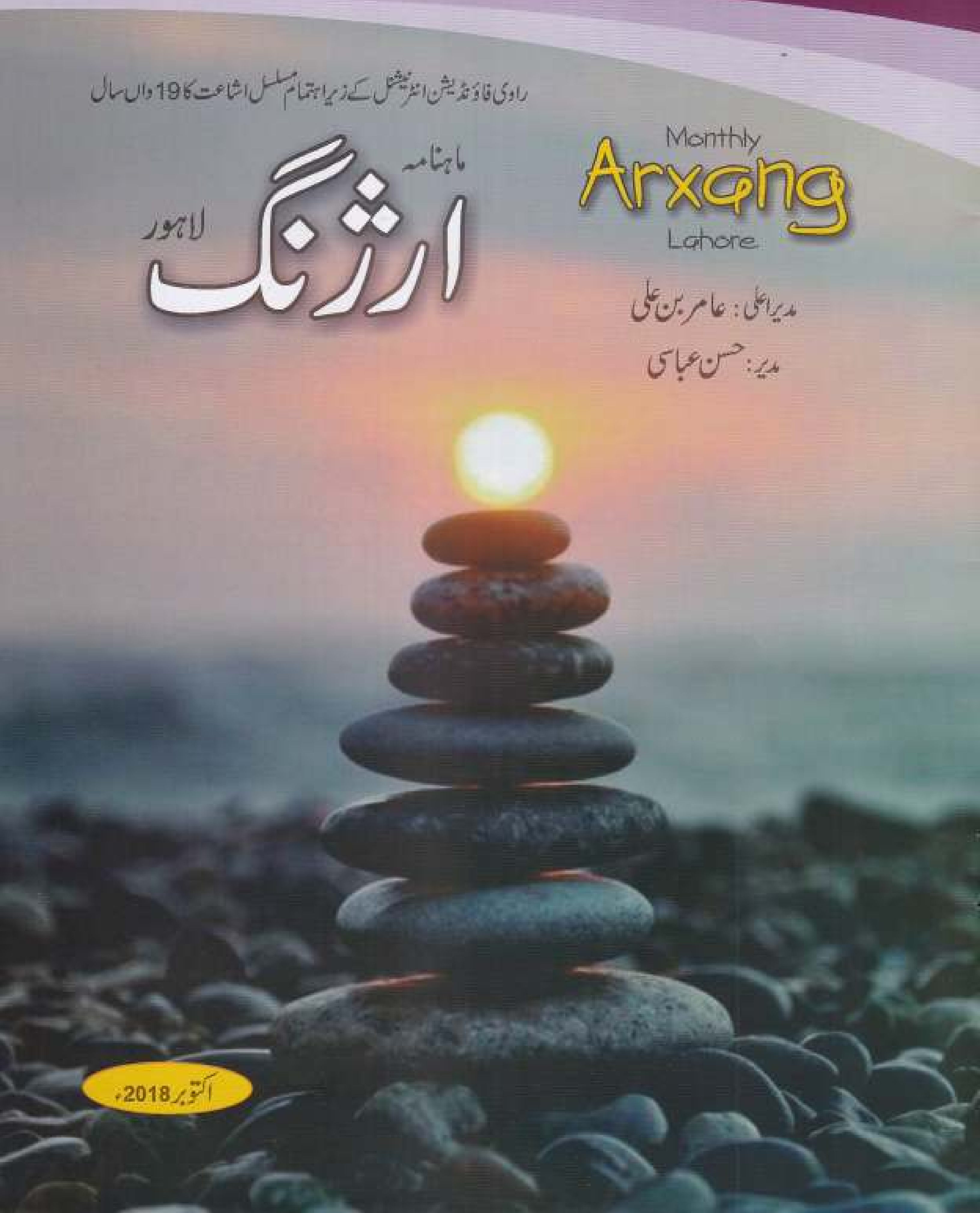

اکتوبر 2018ء

شاعری عطیہ خداوندی ہے، آمد ہے
ایسی عطا ہے جو خاص لوگوں کو ودیعت ہوتی ہے

رنگ، خوشبو، محبت اور شدتِ احساس کی معروف شاعرہ، کالم نگار اور مدیر

ناز بٹ

سے مدیرِ اعلیٰ ارژنگ معروف شاعر، کالم نگار، سفرنامہ نگار

عامر بن علی کا مکالمہ

سوال: سب سے پہلے تو اپنے ادبی اور سوانحی پس منظر سے آگاہی دیجئے

ناز بٹ: میرا تعلق کراچی اور لاہور دونوں شہروں سے ہے، 15 اکتوبر کو لاہور میں پیدا ہوئی، ابتدائی تعلیم کراچی سے حاصل کی، سینٹ پیٹرکس کالج سے انٹر سائنس، کراچی یونیورسٹی سے گریجویشن کرنے کے بعد لاہور سے ایم اے سو نہایت غیر محسوس طریقے سے انہوں نے اقبال کو ہماری زندگیوں میں شامل کر دیا، یوں سمجھیں کہ اسکول کی کتابوں کے ساتھ ساتھ بانگِ درا، بالِ جبریل، ارمغانِ حجاز، شکوہ جواب شکوہ، پیامِ مشرق اور جاوید نامہ کے درمیان آنکھ کھولی، والدہ شام میں ہمیں اسکول کے ہوم ورک کی تیاری کرواتی تھیں جبکہ رات کو والد صاحب ذہین طالبہ رہی، اسکول اور کالج کے زمانے میں نصابی و غیر نصابی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا بلکہ اسکول کالج کی نمائندگی بھی کرتی رہی اور انعامات بھی حاصل کئے، اردو انگریزی تقریری مقابلوں میں بھی اپنے کالج کی نمائندگی کرتی رہی، ایتھلیٹ بھی تھی، والدہ کی خواہش پر کراٹے کلاسز جوائن کیں اور بلیو بیلٹ حاصل کی۔

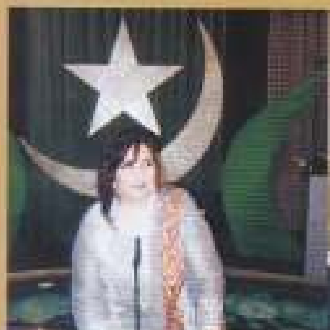

ہمارے معاشرے میں مردوں کا ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو عورت کو اسیر دیکھنے میں ہی اپنی ذہنی تسکین حاصل کرتا ہے

انگلش کیا، نہایت ادبی ماحول میں پرورش ہوئی، والد صاحب شاعر تھے اور پیشے کے اعتبار سے انجینئر، جبکہ والدہ درس و تدریس کے شعبہ سے وابستہ تھیں والد صاحب انتہائی باذوق شخصیت کے مالک تھے انہیں عربی اور فارسی پر بھی عبور حاصل تھا اور اقبال سے عشق بھی۔۔۔ ہوتے تھے، اقبال اور ہم بہن بھائی۔۔۔۔ وہ اقبال کے اردو اور فارسی کلام کے ایک ایک مصرع کی تشریح اور تفسیر ہمیں اس طرح سمجھاتے تھے کہ ازبر ہو جاتا اور میرا دل کرتا تھا کہ یہ سیشن کبھی ختم نہ ہو، مصوری سے میری دلچسپی بھی والد صاحب کی طرف سے وراثت میں ملی۔

سوال: ادب سے لگاؤ کے بارے میں بتایئے، کب سے شعر کہہ رہی ہیں اور باقاعدہ شاعرہ ہونے کا احساس کب ہوا؟

ناز بٹ: ادب سے لگاؤ کا کیا کہا جائے۔۔۔۔ آپکو بتایا کہ آنکھ ہی ایسے ماحول میں کھولی، کتابوں سے محبت کرنا ہماری گھٹی میں شامل تھا، والد صاحب شاعر تھے سو نہ

(مکمل انٹرویو اندرونی صفحات)

راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیر اہتمام مسلسل اشاعت کا 19 واں سال

Monthly
Arxang
Lahore

عالمی سطح پر اردو ادب کا ترجمان

ماہنامہ
ارژنگ
لاہور

جلد نمبر 19 ستمبر، اکتوبر 2018 شمارہ نمبر 9-10

مدیر اعلیٰ ◉ عامر بن علی

مدیر ◉ حسن عباسی

{مجلس ادارت}

ڈاکٹر صغرا صدف ◉ ابرار ندیم ◉ لبنیٰ صفدر

{مجلس مشاورت}

◉ ڈاکٹر جعفر حسن مبارک

◉ ظفر خان (امریکا) ◉ ارشد نذیر ساحل (سپین) ◉ ناز اوکاڑوی

کمپوزنگ • زرتاب کمپوزنگ : 0321-4730769 ڈیزائنر • نعمان حسن: 0333-4918383

آرٹ اینڈ گرافکس • محمد احسن گل : 0300-4529821

پتہ برائے خط کتابت

ماہنامہ ارژنگ

F-3 الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور

حسن عباسی: 0300-4489310 ناز اوکاڑوی : 0301-4492133

nastalique786@gmail.com

سالانہ ممبر شپ

ماہنامہ "ارژنگ" کے سالانہ خریدار بننے کے لیے مندرجہ ذیل نام اور شناختی پر مبلغ /1000 روپے
بذریعہ جاز کیش، ایزی پیسہ، موبی کیش، یو پیسہ، یو بی ایل اومنی سے رقم بھیجیں اور سالانہ خریدار بن جائیں۔ مجلے کی کاپی اعزازی بھیجی جائے گی۔

حسن محمود 0300-4489310 شناختی کارڈ نمبر 31204-7298386-9

فہرست

حمد و نعت / ، ۲

مضامین:

○ انشائیہ کے روپ مختلف اصناف ادب میں / پروفیسر جمیل آذر ، ۴

○ بے چین منٹو / نیلم احمد بشیر ، ۷

○ آپ ہیں کون؟......ڈاکٹر انوار احمد / ڈاکٹر مختار عزمی ، ۹

○ دریا سے صحرا تک......اور جعفر حسن مبارک / ظفر عجمی ، ۱۱

○ لاہور کی قدیم ادبی تنظیمیں / محمد ممتاز راشد لاہوری ، ۱۴

○ ہو گیا ہم کو پیار صاحب سے / محمد امین ساجد سعیدی ، ۱۷

افسانے

○ دو وقت کی روٹی / محمد طارق علی ، ۱۹

○ شیشہ اور سنگ / سیما پیروز ، ۲۳

تراجم:

○ ننھا معمار / ریڈیارڈ کپلنگ، مترجم: نجیب عمر ، ۳۰

سفرنامہ

○ نوبیل انعام یافتگان کا ترک وطن / عامر بن علی ، ۳۲

○ انٹرویو: ڈاکٹر امجد پرویز ، ۳۳

○ انٹرویو: ناز بٹ ، ۳۶

شعری گوشے:

○ ملک سلیم اختر، وحید ناز ، ۳۹ تا ۴۰

○ شاعری ، ۴۱

○ سمندر پارسے ، ۴۴

مختصر ادبی خبریں ، ۴۵

تبصرہ کتب ، ۴۶

نامہ ہائے احباب ، ۴۸

+++++

Far East Marketing Co.

Samaria Mansion 605 Koenji-Minami 1-6-5
Suginami-Ku, Tokyo, 166-0003 Japan
E-mail: femc1@hotmail.com

حمد و نعت

حمد

بنا تیرے ہے کب دارومدار
خدایا تجھ پہ سب دارومدار
زمانے تیرے رستے پر چلیں
کریں چین و عرب دارومدار
تجھی پر ہے، ہمیشہ سے رہا
ہمارا روز و شب دارومدار
تجھی سے سب کے سب ہیں فیصلے
تجھی سے سب کا سب دارومدار
تری بخشش سے عزت پا گیا
مرا نام و نسب، دارومدار
کرے گا تیری رحمت پر سدا
یہ ثاقب، تشنہ لب، دارومدار
تخلیق وہ بھی خالق شام وسحر کی ہے

آصف ثاقب/بوئی ہزارہ

حمد

دیکھ تو اہتمام صاحب کا
بادلوں میں ہے نام صاحب کا
جو محبت کی سمت آئے ہیں
اُن کو پہنچے سلام صاحب کا
اب تو خاموشی توڑ سکتا ہوں
سُن چکا ہوں کلام صاحب کا
فصل میں بھی اُگاتا ہوں لیکن
سب ہی لیتے ہیں نام صاحب کا
بہتے رہتے ہیں آنکھ سے آنسو
کرتا رہتا ہوں کام صاحب کا
میری اوقات سے زیادہ ہے
جو بھی ہے انتظام صاحب کا
سارا دن اُس کو ٹھیک کرتا ہوں
مال آتا ہے خام صاحب کا
میں اگر سانس کھینچ لیتا ہوں
پیہ ہوتا ہے جام صاحب کا
کیسے خود کو دکھائی دیتا میں
ہر جگہ تھا قیام صاحب کا

حسن عباسی/لاہور

نعت

چھیڑیے ذکر پرلطیف شاہ کے خدوخال کا
دیدہ و دل کا ہے چراغ تذکرہ اس جمال کا
ان کا وجود تب بھی تھا پیش اللہ بشکل نور
جاری ہوا نہ تھا ابھی سلسلہ ماہ و سال کا
اس نے الوہیت کی آپ پہلی تجلی ہیں
جلوہ ہوا جب آشکار خالق ذوالجلال کا
آئی نسیم جاں فزا مہکا مشامِ کائنات
عنبریں زُلف کا کھلی نافہ کھلا غزال کا
حسن عمل ہے آپ کا بزمِ جہاں میں جلوہ ریز
عکس ہے سو بہ سو عیاں آئینہ مقال کا
ایک جھلک جو دیکھ لے دیدہ و دل چمک اُٹھیں
رنگ ہے جاذب نظر اس گل نونہال کا
اشک تھے میرے ترجماں دل بنا کاسۂ مراد
پیش مواجہ کب رہا ہوش مجھے سوال کا
جلوۂ دید مصطفیٰ جس کو نصیب ہو گیا
زندگی بھر اسے رہا پھر تو مزا وصال کا
جس کو عمرؓ پکارتے سیدنا بلالؓ سے
پا نہ سکیں گے کج کلاہ مرتبہ اس بلالؓ کا
آپ کے دین میں نہیں نرمی و شدتِ فزوں
راہرو حق کو مل گیا راستہ اعتدال کا
ہے وہی بخت ورثمر آئے کمی نہ اُس کے گھر
جو ہے گدائے بے نوا اپنے نبی کی آل کا

عبدالسلام ثمر/بہاولپور

نعت

ذکر جب آپؐ کا ہو نیند کہاں آتی ہے
درد دل میں، تو مرے لب پہ فغاں آتی ہے
ذکر جس بزم میں ہوتا ہے مرے آقاؐ کا
پھر تو خوشبوئے محبت ہی وہاں آتی ہے
جس میں ہوتا ہے فقط ذکرِ محمدؐ ہر دم
سب غلاموں کو وہی ایک زباں آتی ہے
آپؐ کے نام سے آغاز کا اعجاز ہے سب
ورنہ قوت مرے لفظوں میں کہاں آتی ہے
میں نے دیکھی ہے غلامانِ محمدؐ کی خاک
قبر ہوتی ہے وہاں خوشبو جہاں آتی ہے
ایسے ہو جاتا ہوں میں ذکرِ محمدؐ کے بعد
جس طرح مردہ کسی جسم میں جاں آتی ہے
جن دیاروں میں چلی آئے درودوں کی بہار
اُن دیاروں میں کہاں آسی خزاں آتی ہے

عدیل احمد آسی/ڈنمارک

بسمل صابری کے تازہ نعتیہ شعری مجموعہ "بیاضِ نظر" سے

بصد خلوص و کرم احترام لکھ دینا
کہ میرے دل پہ محمدؐ کا نام لکھ دینا
حرا کا چاند ہے ماہِ تمام لکھ دینا
مدینے جا کے بسر ہو وہ شام لکھ دینا
بشر کو کہہ دیا خیرالبشر زمانوں کو
خدا کے لب پہ بھی ہے یہ کلام لکھ دینا
ہیں تابِ عشق سے روشن ہزار سینائیں
جمالِ عشق سے ہے یہ نظام لکھ دینا
رضائے ذاتِ الٰہی جو ساتھ رہتی ہے
ہر ایک سانس میں ہے ان کا نام لکھ دینا
یہ مہر و ماہ بھی تخلیق ہیں اسی کے لیے
انہیں یہ کس لیے بخشا خرام لکھ دینا

فضائیں ساری ہی مدحت سرائی کرتی ہیں
بس ایک کن سے بنا ہے نظام لکھ دینا
مرے ہی اشکِ ندامت کی بارشیں ساری
چمک اُٹھے مری قسمت مدام لکھ دینا
جو کائنات میں ہر سُو ہے حسنِ زیبائی
اُنہی کا نام ہے روشن سلام لکھ دینا
یہ آرزو ہے کہ مژدہ کوئی سنا جائے
کٹیں مدینے میں اب صبح و شام لکھ دینا
میں شاخِ درد ہوں بھٹکی ہوں روشنی کے لیے
ہوا کے نام مرا اک پیام لکھ دینا

جبیں بھی شمعِ عرفاں میں سجدہ ریز ہے اب
ہے روح وجد میں یہ شوقِ تمام لکھ دینا
فقیرِ درد ہوں مر جاؤں تیری چوکھٹ پر
مرے نصیب میں زم زم کا جام لکھ دینا
خدا کرے مجھے شہرِ نبیؐ کی دھول ملے
یہ عرضِ حال تو عالی مقام لکھ دینا
درِ رسولؐ کے ذرّے تلاش کرتی ہوں
کہ سرمئی سی ذرا ایک شام لکھ دینا
خدا کرے ہو ٹھکانہ مرا مدینے میں
فنا کے بعد بھی اذنِ قیام لکھ دینا
وہ جتنے داغ ہیں بسملؔ تمام دھل جائیں
درود پڑھتی رہوں میں مدام لکھ دینا

چادر تنی ہوئی ہے مرے سر پہ نور کی
مجھ کو طلب نہیں ہے حریر و سمور کی
چنتی رہی ہوں پھول میں طیبہ کے باغ سے
خوشبو بسی ہوئی ہے مرے دل میں طور کی
صدیاں تری، زمانے ترے، حکمرانیاں
صلِ علیٰ کی روشنی ربِ غفور کی
پہنچی ہوں شہرِ طیبہ میں اب عمر بھر کے بعد
اس حاضری سے مل گئی دولت سرور کی
اذنِ سفر ملا بھی تو بس اُن کے نام سے
مجھ پر عطائے خاص ہے رحمت حضور کی
ختم الرسل ہیں آپ نہ آئے گا اب نبیؐ
مریم کو مل چکی تھی بشارت حضورؐ کی
زخموں کو جب بھی مدحتِ شاہ سے رفو کیا
ندیاں شعورِ ذات سے نکلیں بحور کی
ان نعمتوں کا شکریہ کیسے کروں ادا
تطہیرِ قلب و جان ہے دعوت وہ نور کی
ساری زمیں پہ نور ترا ابر اور ہوا
آنکھوں میں حیرتیں وہیں یہ عظمت حضورؐ کی
قدموں میں تھی بچھی ہوئی کونین شاہ کے
بستر تھا صرف ایک چٹائی کھجور کی
لطف و کرم کمال کی دولت عطا ہوئی
معمور سب جہاں پہ ہے شفقت حضورؐ کی
مجھ کم سخن پہ رحمتیں برسی ہیں چار سُو
سایہ فگن ضیائیں ہیں سب رنگ و نور کی
حاجت روا کو سنتِ سرکارؐ چاہیے
مجھ کو یقیں ہے ساتھ ہے رحمت حضورؐ کی
دامانِ مصطفیٰؐ میں کہیں بھی جگہ ملے
بارش ہے رحمتوں کی درودوں کی نور کی
بیٹھی ہوں اب سنبھالے ہوئے دل فگاریاں
دریائے غم سے نکلی ہیں موجیں سرور کی
بسملؔ عطائے خاص شفاعت ہو روزِ حشر
دل میں بسی ہوئی ہے محبت حضورؐ کی

انشائیہ کے روپ مختلف اصناف ادب میں

پروفیسر جمیل آذر

گزشتہ صدی ستر کی دہائی میں انشائیہ نگاری پر بڑے زور شور کے ساتھ بحث چلی تھی۔ اس بحث میں پروفیسر سیّد مشکور حسین یاد نے ایک بڑی اہم بات کی تھی کہ انشائیہ ام الاصناف ہے۔ میں آج بھی اُن کے اِس جملے کو قدر و منزلت سے یاد کرتا ہوں۔ انشائیہ کا لفظ انشا سے مستنبط ہے۔ انشا کا معنی ہے پیدا کرنا یا تخلیق کرنا۔ ۱۹۶۴ء میں جب ڈاکٹر وزیر آغا کی عالمانہ ادارت میں اوراق کا اجرا ہوا اور اس کے ساتھ ہی اُن کی بصیرت افروز راہنمائی میں انشائیہ کی تحریک کا آغاز ہوا تو میں اور مشتاق قمر (مرحوم) نے اُن کے ساتھ قدم ملا کر انشائیہ نگاری کے فروغ کا عزم کیا۔ اس کے پہلے شمارے میں مشتاق قمر کا ''چھڑی'' اور میرا ''پکنک'' کے عنوان کے ساتھ انشائیے شائع ہوئے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کو انشائیہ نگاری کے ساتھ والہانہ عشق تھا اور وہ ہر اس ادیب کو انشائیہ نگاری کی ترغیب دیتے تھے جن میں انشائیہ فہمی اور انشائیہ لکھنے کی صلاحیت ہوتی تھی اور پھر یقیناً وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب و کامران ہوئے، پروفیسر غلام جیلانی اصغر اور ڈاکٹر انور سدید جیسے بالغ نظر قلمکار اِس صنفِ ادب میں جگمگانے لگے۔ اوراق کے دوسرے یا تیسرے شمارے میں میرا ایک تنقیدی مضمون انشائیہ نگاری کے حوالے سے شائع ہوا جس کا عنوان تھا ''انشائیہ......ایک لطیف صنفِ ادب'' اس مضمون میں انشائیہ پر گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا تھا ''اپنے اِس مخصوص مزاج کی بنا پر انشائیہ ایک لطیف صنفِ ادب ہے کیونکہ اِس میں غزل کا سا ایجاز، افسانے کا سا تاثر، ناول کا سا فلسفۂ حیات اور ڈرامے کے سے انتظاریہ لمحات اور ان کے پس منظر میں شگفتگی کی دھیمی دھیمی سمفنی (Symphony) ہوتی ہے اور ان سب پر مستزاد انکشافِ ذات کا عمل جو خاص انشائیہ کے لیے مختص ہے۔ یہی وہ مقتضیات ہیں جن کا انشائیہ میں ہونا ضروری ہے۔'' اس زمانے میں نئی نظم کا ابتدائی شہرہ تھا اور مجید امجد، ن۔م۔راشد، فیض احمد فیض اور ضیاء جالندھری وغیرہ اپنے ابتدائی سفر طے کر رہے تھے ورنہ میں نظم کا ذکر بھی ضرور کرتا کہ انشائیہ میں نظم کا حسن، بانکپن اور علامتی اظہار بھی ہوتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے میرے اِس مضمون کو بے حد پسند فرمایا تھا اور مجھے انشائیہ پر تنقیدی مضامین لکھنے کے لیے بار بار یاد دہانی کراتے تھے۔ اور میں نے اُن کے ارشاد کی تعمیل میں تین چار اور مضامین سپردِ قلم کیے۔ نہ صرف یہ بلکہ ہر انشائیہ نگار کی انشائیوں پر جو کتاب منظرِ عام پر آئی اس پر مضمون سپردِ قلم کر کے انشائیہ کی تحریک کو جس کا آغاز ڈاکٹر وزیر آغا نے کیا تھا مزید تقویت بخشی۔ جن انشائیہ نگاروں پر مضامین قلمبند کیے اُن میں وزیر آغا، غلام جیلانی اصغر، ڈاکٹر انور سدید، اکبر حمیدی، غلام الثقلین نقوی، سلیم آغا قزلباش، انجم نیازی، محمد اسد اللہ (بھارت) پروین طارق، ناصر عباس نیّر، شفیع ہمدم اور اے غفار پاشا شامل ہیں۔ اِن تنقیدی مضامین پر مشتمل مجموعہ ''انشائیہ اور انفرادی سوچ'' کے نام سے ۲۰۰۴ میں منظرِ عام پر آیا۔ اس کتاب کو میں نے بابائے انشائیہ ڈاکٹر وزیر آغا کے نام معنون کیا۔

اِس مختصر سے تعارف کے بعد میں اپنے اصل موضوع کی طرف آتا ہوں کہ انشائیہ کے روپ مختلف اصناف ادب میں کس طرح ظہور پذیر ہوئے ہیں۔ میں جب بھی کسی ناول، نظم، غزل، افسانہ، سفرنامہ یا آپ بیتی کا مطالعہ کرتا ہوں تو مجھے انشائیے کے عناصر مل جاتے ہیں۔ انشائیہ کی پہلی پہچان تو یہی ہے کہ اس میں تخلیقی حسن ہو، نیا پن اور اصلیت (Originality) ہو اور بے ساختگی (Spontneity) ہو۔ انفرادی سوچ کا حامل ہو اور مصنف کی ذات کی مکمل شمولیت ہو۔ میں اپنے مضمون میں چند تخلیقات سے کچھ اقتباسات پیش کر کے انشائیے کے مختلف روپ دکھانے کی کوشش کروں گا جو یقیناً انشائیے کی تفہیم میں مددگار ثابت ہوں گے۔ قرۃ العین حیدر کے ناول ''آگ کا دریا'' سے یہ دو مختصر پیراگراف ملاحظہ کیجیے:

''ورندا بن میرے انگ انگ میں رچ گیا ہے۔ صبح سویرے منڈیر پر رکھی ہوئی گاگریں دھندلکے میں جھلملاتی ہیں۔ گایوں کی گھنٹیوں کی آواز، سبز گھاس کی گرم گرم مہک، دودھ کے سفید جھاگ، جنگل کی ہریالی، میری آتما چین سے بھر گئی۔ رات کو ستارے ورندا بن پر جھک کر اسی چین کا جاپ کرتے ہیں۔ پرندوں کے پروں کی مدھم سرسراتی آواز ادم ادم کا کیرتن کر رہی ہے۔ میرے اندر سکون لہریں مار رہا ہے جیسے چاندنی کی لہریں جمنا پر پھیل جاتی ہیں۔ رنگ......روشنی......موسیقی، کرشنا! کرشنا، موہن، ہری، نندلالہ، کانہا......اس کا ہر نام الوہی رنگ کے نئے سر کی طرح بجتا چلا جا رہا ہے، وہی اس کو جان سکتے ہیں جو اس سے محبت کرتے ہیں۔''

''اور یکایک سنہری موسیقی کی بوچھاڑ میرے کانوں پر آن گری، جیسے ہر سُر کے کنارے ایک ستارہ جل رہا ہو اور پھر یہ پھوار تیز رنگوں والی دھنک میں تبدیل ہو گئی اور اس کی تیز جگمگاہٹ کی تاب نہ لا کر میں نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ مجھے پتا نہ چلا کہ میں موسیقی کو

سن رہی ہوں یاد یکھ رہی ہوں۔اس سے مجھے معلوم ہوا کہ سادھی کا مطلب کیا ہے، وہ لمحہ جب روح پرم آتما کے روبرو کھڑی ہو کر کہتی ہے ...... یہ میں ہوں۔"

آپ ان مختصر سے دو پیراگراف سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ سوچ کی لہریں آپ کو الوہی کائنات (Divine Universe) سے کس طرح ہم آہنگ کرتی ہیں۔ یہ خالص انشائی روپ ہے جو ہمیں اس ناول میں جا بجا ملتے ہیں۔ سوچ کی ان الوہی لہروں میں مصنف کی ذات مکمل طور پر شامل ہے۔

انشائیہ کے روپ جدید نظموں میں جا بجا ملتے ہیں۔ نئی نظم میں مصنف نہ صرف اپنی انفرادی سوچ کا بھرپور اظہار کرتا ہے بلکہ اس میں اوریجنلٹی (Originality) کی خوبصورت عکاسی ہوتی ہے۔ انشائیہ میں جتنی تازہ کاری، اصلیت اور شگفتگی آئے گی انشائیہ اتنا ہی دلچسپ، فکر انگیز اور فکری انبساط کا حامل ہوگا۔ میرے سامنے ڈی جے ایزائٹ (D.J.Enright) کی ایک نظم باغی (The Rebel) پڑی ہے میں یہاں انگریزی متن کی بجائے صرف اس نظم کا اردو ترجمہ پیش کروں گا تا کہ آپ اندازہ کر سکیں کہ مصنف نے کس طرح عام ادب سے ہٹ کر نئی بات پیش کی ہے جو قابلِ یقین بھی ہے اور دلکش بھی۔

جب ہر شخص اپنے سر کے بالوں کو کتروا کر چھوٹا کرتا ہے تو باغی اپنے بالوں کو لمبا کرنے کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔

جب ہر شخص اپنے بالوں کو لمبا کرتا ہے تو باغی اپنے بالوں کو چھوٹا اور مختصر کر لیتا ہے

جب سبق کے دوران ہر شخص بڑھ چڑھ کر بولتا ہے تو باغی چپ سادھ لیتا ہے اور ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالتا

جب سبق کے دوران کوئی شخص نہیں بولتا تو باغی گڑ بڑ پیدا کرتا ہے

جب ہر شخص یونیفارم پہنے پھرتا ہے تو باغی عجیب و غریب لباس پہنتا ہے

جب ہر شخص عجیب و غریب لباس پہنتا ہے تو باغی نہایت سنجیدہ لباس میں ملبوس ہوتا ہے

کتوں سے پیار کرنے والی مجلس میں باغی بلیوں کو پیار کرتا ہے اور انہیں کتوں پر ترجیح دیتا ہے

بلیوں سے پیار کرنے والی مجلس میں باغی کتوں کے لیے اچھے اچھے الفاظ بولتا ہے

جب ہر شخص دھوپ کی تعریف کرتا ہے تو باغی بارش کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے

جب ہر شخص بارش کو خوش آمدید کہتا ہے تو باغی دھوپ کے نہ ہونے پر اظہار افسوس کرتا ہے

جب ہر شخص جلسے میں جاتا ہے تو باغی گھر میں رہنے اور کتاب پڑھنے میں محو ہوتا ہے

جب ہر شخص یہ کہتا ہے "یس پلیز" تو باغی کہتا ہے "نو تھینک یو"

جب ہر شخص یہ کہتا ہے "نو تھینک یو" تو باغی کہتا ہے "یس پلیز"

آخر میں شاعر کہتا ہے "یہ کتنی اچھی بات ہے کہ ہمارے ہاں ایسے باغی ہیں، ہو سکتا ہے آپ اس باغی کے ہونے کو پسند نہ کریں!"

آپ نے غور فرمایا کہ مصنف نے کتنے اخلاص کے ساتھ باغی کے ساتھ اپنی مکمل شمولیت، پسندیدگی اور شرکت کا اظہار کر کے اپنی ذات کا کتنے کھلے طور پر انکشاف کیا ہے۔ مجھے یہاں پچاس یا ساٹھ کا عشرہ یاد آ گیا۔ یل برائنر نے ایک انگریزی فلم "دی کنگ اینڈ آئی" میں بادشاہ کا رول ادا کیا تھا۔ یل برائنر نے اپنے سر کے بالوں کو مکمل طور پر استرے سے صاف کروایا ہوا تھا۔ گویا سر مکمل طور پر انڈا بنا ہوا تھا۔ مگر وہ اس فیشن میں اتنا دلکش ہیرو لگا کہ کالج کے نوجوان طلباء نے اپنے سروں کو مکمل طور پر بالوں سے نجات دلا کر ٹنڈ منڈ کرا لیا۔ یل برائنر کا یہ خالص انشائی (تخلیقی) روپ تھا جس کی جلوہ نمائی نہ صرف عام ڈگر سے ہٹ کر ہوئی بلکہ اس وقت کا مقبول فیشن بن گیا۔

انشائیے کا ایک اہم عنصر خود کلامی (Soliloquy) ہے۔ انشائیہ نگار اپنی ذات سے ہمکلام ہو کر کبھی زندگی کی فلسفیانہ توجیہہ کرتا ہے تو کبھی مسائل کو حل کرنے کی سعی بسیار کرتا ہے۔ شیکسپیئر کے ڈرامہ کا مرکزی کردار ہیملٹ کی مندرجہ ذیل خود کلامی انشائی فن پارے کا خوبصورت نمونہ ہے:

To be, or not to be, that is the question:
Whether 'tis nobler to the mind to suffer
The slings and arrows of outrageous for tune
Or to take arms against a sea of troubles
And by opposing end them.

(کیا میں اپنے وجود کا خاتمہ کر لوں یا پھر یوں ہی زندگی بسر کرتا رہوں)

یہی وہ اہم سوال ہے جو مجھے اذیت دے رہا ہے۔ ان دو چیزوں میں سے ارفع ترین کس عمل کا انتخاب کروں۔ یا تو میں صبر وضبط سے کام لیتا ہوا قسمت کے ظالمانہ تھپیڑوں کو برداشت کرتا رہوں یا جرأت مندی سے کام لے کر اپنی جانب بڑھتے ہوئے مغلوب کر دینے والے مصائب کے سمندر کا بہادری کے ساتھ مقابلہ کروں اور انہیں شکست دے دوں......)

شیکسپیئر کا یہ یادگار ڈرامہ کتنے ہی انتظاریہ لمحات کے ناقابلِ فراموش نقوش قاری کے دماغ پر چھوڑتا چلا جاتا ہے تاآنکہ ہیملٹ اپنی بہادری، جوانمردی اور شمشیر زنی کا شاندار مظاہرہ کرتا ہے۔ وہ مشکلات، مصائب کے سامنے سپر انداز نہیں ہوتا بلکہ اُن کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے جان جانِ آفرین کے سپرد کردیتا ہے۔

ایجاز و اختصار، اسلوبِ فکر و بیان کی تازہ کاری انشائیے کے خوبصورت جوہر ہیں۔ رشید امجد کے بیشتر افسانے انشائیے کے دلکش نمونے پیش کرتے ہیں۔ اس کے افسانوں میں انفرادی سوچ اور تخلیقی شعلگی ہے، فلسفیانہ فکر کی لہریں اور اسلوب کی سادگی و سلاست اور ایجاز، اختصار کا حسن ہے، اور جب سے اس کے افسانوں میں مرشد کا کردار داخل ہوا ہے تب سے تو عرفانی صداقت کا نور قاری کے ذہن کو مستنیر کرنے لگا ہے۔ اس کے ایک افسانے ''خواہش موج زن'' کا آخری ٹکڑا ملاحظہ کیجیے:

''لیکن اب سفر کہاں...... ایک زمانہ تھا کہ رات گئے تک گھر آنے کو جی نہیں چاہتا تھا اور اب گھر سے نکلنے کی خواہش نہ ہوتی۔ بیوی کہتی بھی کہ کسی محفل میں ہو آؤ، دوستوں سے مل آؤ لیکن وہ صوفے میں دھنسا اخبار پڑھتا یا ٹی وی کے چینل بدلتا رہتا۔

''شاید سب کچھ ایک نقطے پر اٹک گیا ہے'' اس نے مرشد سے کہا ''تیز رفتاری کے بعد کہیں ایک نقطے پر اٹکنا آگے جانے کے لیے ایک لمبا سانس لینے کا وقفہ ہے''

یہ آخری جملہ انشائیہ کا ناقابلِ فراموش ٹکڑا ہے۔ انشائیہ طوالت کا متحمل نہیں ہوتا۔ وہ بہت کچھ ان کہی باتیں قاری کے زرخیز تخیل پر چھوڑ دیتا ہے۔ انشائیہ میں جتنا نیا پن اور اصلیت (originality) ہوگی اتنا ہی وہ تخلیقی حسن کا حامل ہوگا۔ میں نے اوپر ذکر کیا ہے کہ انشائیہ میں غزل کا سا ایجاز ہوتا ہے۔ ایک بلند پایہ غزل گو بڑی سے بڑی بات غزل کے دو مصرعے میں کہہ دیتا ہے اور وہ زبان زدِ خاص و عام ہو جاتی ہے۔ وہ عام بات میں بھی نیا پن پیدا کر دیتا ہے۔ ہمارے ہاں غزل گو شعرا کی ایک عظیم کثرت ہے۔ میں یہاں مثال کے طور پر غالب کے ایک دو شعر پیش کرنے پر اکتفا کروں گا جو نہ صرف ایجاز کے بلکہ تخلیقی حسن کے شاہکار ہیں:

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
ساغرِ جم سے مرا جام سفال اچھا ہے

....

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

ان دونوں اشعار میں شاعر نے دریا کو کوزے میں بند کر دیا۔ اصلی تخلیق کار کے پاس جادو کی چھڑی ہوتی ہے جسے ہم فکر تازہ کا کمال بھی کہہ سکتے ہیں۔ پہلے شعر میں انہوں نے مٹی کے پیالے کو شاہی بلوری پیالے سے افضل بنا دیا اور دوسرے شعر میں انہوں نے زندگی کے لطف و سرور کو مرنے سے ہم آہنگ کر دیا۔ یہ ان کے ایجاز کا بھی کمال ہے اور فکر تازہ کا اعجاز بھی ہے۔ اقبال نے یوں ہی تو نہیں غالب کے بارے میں کہا تھا ''تیری کشتِ فکر سے اگتے ہیں عالم سبزہ وار'' ایک اچھا انشائیہ نگار نہ صرف ایجاز کو ملحوظِ خاطر رکھتا ہے بلکہ فکر تازہ کی دنیا بھی آباد کرتا ہے۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ انشائیہ لکھنا مشکل ترین فن ہے۔ یہی وجہ ہے دنیائے ادب میں انشائیہ نگار انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا کو چونکہ انشائیہ نگاری سے یہ ایک فطری لگاؤ تھا اور اس سلسلے میں وہ اُن ادیبوں کی راہنمائی بھی کرتے تھے جن میں وہ انشائیہ نگاری کا ٹیلنٹ پاتے تھے۔ اتفاق سے ایک صاحب کی انہوں نے اس سلسلے میں راہنمائی کی اور اُن کے ایک دو انشائیوں میں اصلاح بھی کی اب وہ سمجھے کہ انہیں انشائیہ نگاری پر مکمل عبور ہو گیا۔ چنانچہ انہوں نے ایک دو سال میں اپنے انشائیوں کے کئے مجموعے شائع کروا دیئے میں نے ڈاکٹر صاحب کی اس طرف توجہ مبذول کی کہ اُن کے ہاں صرف ایک دو تو انشائیے نظر آتے ہیں باقی سب ٹریش ہے۔ انہوں نے مجھ سے اتفاق کیا۔ ڈاکٹر انور سدید نے میرے بارے میں کہا تھا کہ جمیل آذر انشائیہ نگاری میں کچھوے کی چال چلتا ہے۔ اس سے اُن کی مراد یہ تھی کہ میں بہت کم انشائیے لکھتا ہوں۔ اُن کی بات سے مجھے مکمل اتفاق ہے۔ میں تب انشائیہ لکھتا ہوں جب انشائیہ مجھ پر تائید الٰہی سے نازل ہوتا ہے۔ میں نے جب بھی زبردستی انشائیہ لکھنے کی کوشش کی بری طرح ناکام ہوا۔ میں ادب کا ادنیٰ سا طالب علم ہوں۔ لیکن میری ساری زندگی ادب پڑھنے، ادب پڑھانے اور ادب لکھنے میں صرف ہوئی۔ میں شاید واحد شخص ہوں جس نے صرف اور صرف انشائیہ فہمی، انشائیہ نگاری اور انگریزی کے عمدہ انشائیہ نگاروں کی تحریریں پڑھنے پر توجہ دی۔ جب سیّد مشکور حسین یاد نے یہ کہا تھا کہ انشائیہ ام الاصناف ہے تو اُن کی اس سے میری دانست میں شاید یہی مراد تھی کہ تخلیق اور صرف تخلیق ہی ''ادب'' ہے۔ اگر تخلیقی شعلگی کسی تحریر میں نہیں ہے تو وہ اعلیٰ ادب میں شمار نہیں کی جا سکتی۔ چونکہ انشائیہ کا تعلق نثری تخلیق سے ہے اور ابتدا میں ہی پیدائش کے بعد انسان گفتگو بھی نثر ہی میں کرتا ہے۔ جب نثر میں تخلیقی جوہر نمودار ہوتا ہے تو وہ انشائیہ بن جاتا ہے۔ انشائیہ خالص تخلیقی ادب ہے لہٰذا اسے ام الاصناف ہی کہنا چاہئے۔ جس مضمون کو میں نے آج سے چھیالیس سال قبل قلمبند کیا تھا یہ کلمات اُس کا تکملہ نہیں۔ وما علینا الا البلاغ!

بے چین منٹو

نیلم احمد بشیر/لاہور

آج کل ہم سب منٹو صاحب کو خوب یاد کر رہے ہیں۔ ہر طرف منٹو، منٹو کی پکار سنائی دے رہی ہے۔ یہاں تقریب، وہاں مذاکرہ، یہاں ڈرامائی تشکیل، وہاں اخباری مضامین، غرضیکہ منٹو صاحب کی لوٹ سیل سی لگی ہوئی ہے۔ اس سے خوانخواستہ ہرگز یہ مطلب نہ لیا جائے کہ مجھے منٹو صاحب کو اس طرح بے تحاشا یاد کرنے سے کوئی مسئلہ ہے۔ جی نہیں، ہرگز نہیں۔ مجھے تو بس رہ رہ کر یہ خیال آتا ہے کہ اتنی مختصر سی عمر میں چوٹی کا ادب تخلیق کر کے امر ہو جانے والے منٹو کی قدر و قیمت ہمیں اتنی دیر میں کیوں معلوم ہوئی؟ آج منٹو صاحب کو ری ڈسکور کیا جا رہا ہے، ان کی کہانیوں کے تجزیے ہو رہے ہیں۔ ان کی شخصیت کی پرتیں کھل کر سامنے آ رہی ہیں اور ان کو زندہ رکھا اور سمجھا جا رہا ہے مگر اے کاش یہ سب کچھ ان کے سامنے ہوا ہوتا تو وہ اس دنیا سے یہ اطمینان لے کر جاتے کہ آخر کار دنیا کو ان کے فن اور ہنر کی قدر و منزلت کا احساس ہو ہی گیا۔ بہر طور اب انہیں وہ مقام دیا جا رہا ہے جس کے وہ واقعی حقدار تھے اور یہ بڑی خوش آئند بات ہے۔ ان کی تحریریں آج بھی اتنی ہی تازہ، دبنگ، جاندار اور ریلی وینٹ ہیں جتنی پچاس برس قبل تھیں اس لیے کہ زمانہ آگے کو تو جا چکا ہے مگر زمانہ بدلا نہیں۔ مسائل جوں کے توں کھڑے ہیں اور نسلِ انسانی اسی طرح دکھی اور پریشان ہے۔ وہ بہر طور اپنا کام خوش اسلوبی سے سرانجام دے گئے جس کے لیے ہی غالباً ان کا جنم ہوا تھا۔ اس دنیا میں انہوں نے پل بھر کو قیام کیا اور اگلی بڑی کہانی کی تلاش میں آگے کو چل دیئے۔ میں خود کو منٹو صاحب کے فن پر لکھنے کے قابل تو نہیں سمجھتی مگر ان کی ایک ادنیٰ قاری کی حیثیت سے یہ ضرور سوچتی ہوں کہ کیا دنیا بھر کے عاشقانِ ادب انہیں صحیح طرح سے پہچان بھی سکے ہیں یا ابھی ہمیں ان کے فن کی گہرائی ماپنے کو اور سفر طے کرنا باقی ہے؟

یہ ایک حقیقت ہے کہ منٹو صاحب معاشی طور پر ایک پریشان حال ادیب تھے۔ اکثر گھر میں اخراجات کے لیے رقم نہ ہوتی، کئی افسانے تو انہوں نے آن آرڈر لکھے تاکہ انہیں کچھ پیسے ملیں اور وہ اپنے بیوی بچوں کی ضروریات پوری کر سکیں مگر وہ اپنی غربت، خرابیِ صحت، شراب نوشی کے باوجود دلجمعی سے لکھتے رہے۔ ڈٹے رہے اور پیچھے نہیں ہٹے اپنی جرات رندانہ کو ایسی موضوعات پر استعمال میں لاتے جن پر قلم اٹھاتے معاشرے کے شُرفا؟ شرماتے اور گھبراتے تھے۔ وہ آج کے ادیبوں کی طرح سوٹڈ بوٹڈ نخرے دار، گاڑیاں چلانے والے، امریکہ یورپ گھومنے والے highly paid رائٹر نہیں تھے مگر عجب بات یہ ہے کہ آج ان کے فن کا تذکرہ زیادہ تر اپر اور ایلیٹ کلاس سے تعلق رکھنے والوں میں زیادہ سننے کو ملتا ہے۔

آج منٹو پہ بات کرنا ایک sophisticated ٹاپک اور فیشن بن چکا ہے قیمتی ملبوسات زیب تن کرنے، عالیشان گھروں میں رہنے اور فر فر انگریزی بولنے والے جب منٹو کو اپنا پسندیدہ ادیب بتاتے ہیں تو میں سوچ میں پڑ جاتی ہوں۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ غریبوں، محکوموں، نچلے طبقے اور پسی ہوئی استحصال کی ماری ہوئی عورتوں کی کہانیاں سننے میں انہیں بھلا کیسے دلچسپی ہو سکتی ہے۔ منٹو کے کردار تو وہ لوگ ہیں جنہیں ایلیٹ کلاس اپنے قریب بٹھانا تک پسند نہیں کرتی۔ ان کے میلے، پھٹے، بدبودار کپڑوں سے گھن کھاتی ہے تو پھر انہیں ان کے دکھوں کی انڈرسٹینڈنگ کیسے ہو سکتی ہے۔ کم از کم میرے پلے تو یہ بات ہرگز نہیں پڑتی۔

یہ بھی ایک عجیب بات ہے کہ منٹو کے بارے میں زیادہ تر مضامین اور تبصرے بھی زیادہ تر انگریزی اخبارات اور رسائل میں ہی شائع ہوتے ہیں۔ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ ہمارے اردو کے قاری کم پڑھے لکھے ہیں اور وہ منٹو کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے؟ کیا آج منٹو صرف ایجوکیٹڈ کلاس، انگریزی بولنے والے طبقے کا ادیب بن کے رہ گیا ہے؟ پتہ نہیں؟ میرا تو یہی خیال ہے کہ منٹو masses یعنی عوام کے آدمی تھے۔ گلی محلوں، تاریک راہداریوں میں رہنے والے لوگوں کی کہانیوں کے مصنف تھے۔ مجھے یقین ہے آج وہ زندہ ہوتے تو خود کو اس طرح اپر کلاس میں مقبول ہوتے دیکھ کر حیرت زدہ ہو جاتے۔ ایسی ہی کسی محفل میں بیٹھ کر ان کا دم گھٹتا جہاں ان کی موزیل، سوگندھی اور دیگر کرداروں کو تو کوئی اندر گھسنے بھی نہ دیتا۔ وہ تو زمین پر رینگنے والے کیڑوں جیسی تقدیر رکھنے والے انسانوں کی داستانیں رقم کرتے تھے ان کا اپر کلاس سے کیا سروکار؟ ان کے کردار نوری تھے نہ ناری وہ تو صرف مٹی کے بنے آدم تھے جو دن رات مسائل کی بھٹی میں ایندھن کی طرح سلگتے رہتے ہیں۔ منٹو صاحب کو اپنی قوتِ تحریر، قابلیت پر حد درجہ اعتماد تھا۔ وہ اپنے فن کو خوب سمجھتے تھے۔ شاید ہر ایک سے بڑھ کر۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ کون ہیں۔ شاید اسی لیے انہوں نے اپنی قبر کے لیے یہ غیر معمولی کتبہ اور عبارت پسند فرمائی تھی۔ ''یہاں سعادت حسن منٹو دفن ہے۔ اس کے سینے میں فنِ افسانہ نگاری کے اسرار و رموز دفن ہیں۔ وہ اب بھی منوں مٹی کے نیچے سوچ رہا ہے کہ وہ بڑا افسانہ نگار ہے یا خدا''۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے دنیا بھر میں شاید ہی کوئی ادیب ہوگا جس نے ایسا انوکھا کتبہ اپنے سرہانے لگوانا چاہا ہوگا۔ مگر مجھے یہ جان کر بہت دکھ ہوا کہ منٹو کی قبر پہ ان کا یہ کتبہ نہیں بلکہ ایک عام سا روایتی کتبہ نصب ہے جس پہ ان کی سنِ ولادت اور وفات کے علاوہ شاید اور کچھ بھی درج نہیں۔ وجہ اس کی یہ بتائی جاتی ہے کہ منٹو کے اہل خانہ کو یہ خوف تھا کہ اس طرح کا کتبہ دیکھ کر مذہبی جنونی کہیں بے قابو ہو کر قبر کے آرام اور احترام کو ڈسٹرب

نہ کردیں۔ مذہبی تنگ نظری اور شدت پسندی میں لتھڑا ہوا ہمارا یہ معاشرہ اللہ سے اس قسم کی دوستی بے تکلفی اور برابری کو بھلا کہاں ہضم کر سکتا تھا۔ دیکھا جائے تو یہ تو محض من تو شدی، تو من شدی والی بات تھی۔ منٹو نے خدا اور انسان کے بیچ کا فرق مٹا دیا تھا۔ اپنے بنانے والے سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے اسے ہلکا سا چیلنج دیا تھا۔ زندگی میں انسان کو درپیش معاشرتی ناانصافیوں پہ چوٹ کی تھی۔ ڈگڈگی کی لے پر بندر کی طرح نچانے والی زندگی کی ہنسی اڑائی تھی۔ اناالحق کا نعرہ بلند کیا تھا تو یہ تو کوئی نئی بات نہیں تھی۔ تاریخ تو ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے جب انسان اور خدا ایک دوسرے میں مدغم ہوتے نظر آتے ہیں۔

بائبل میں ایک جگہ رقم ہے کہ ایک بار حضرت یعقوب اور خدا کے درمیان رات بھر کشتی ہوئی جس میں انہوں نے اللہ کو پچھاڑ دیا۔ جب صبح کے وقت وہ الگ ہوئے تو یعقوب نے خدا سے کہا میں اس وقت تک تجھے جانے نہ دوں گا جب تک تو مجھے اپنی blessings نہ دے گا۔ تبھی خدا نے انہیں یعقوب کا خطاب دیا یعنی خدا اور بندوں کے ساتھ زور آزمائی کرنے والا۔

منٹو بھی غالباً خدا کی ایسی ہی کسی blessing کا طلب گار تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ خدا اور وہ دونوں ہی تخلیق کار ہیں تو پھر اصل میں تو دونوں ایک ہوئے۔ انسان بھی تو خدا کا ہی عکس، اس کا پرتو ہے، اس کا حصہ ہے تو پھر اس میں ایسی اچنبھے کی کون سی بات ہے۔ دونوں کہانی کار ہی تو ہوئے اور دونوں ہی میں سے بڑا تخلیق کار کون ہے...... یہ منٹو صاحب نے سوال کیا تھا۔

یہ بات ہمارے لیے کسی لمحہ فکریہ سے کم نہیں ہے کہ منٹو کے اہلِ خانہ کی دور اندیشی اور ورڈ **تھنکنک** کتنی درست اور صحیح ثابت ہوئی ہے۔ آج ہمارے معاشرے میں مذہبی دھونس ودہشت گردی، تنگ نظری عروج پہ ہے۔ رحمان بابا کا مزار، بامیان کے تاریخی مجسمے، دوسرے مذاہب کی عبادت گاہیں، سبھی کچھ بارود کی ایک آتشیں پھونک کی مار بن کے رہ گئے ہیں جس کو جو چاہے کافر قرار دے کر مار ڈالے، کوئی کبھی بھی نہ پوچھے گا۔ افسوس! سچ تو یہ ہے کہ اگر منٹو صاحب کا پسندیدہ من چاہا کتبہ ان کی قبر سرہانے لگا ہوتا تو واقعی ریزہ ریزہ کر دیا گیا ہوتا۔ مجھے یقین ہے یہ سوچ جان کر منٹو صاحب یقیناً قبر میں چین نہ پاتے ہوں گے، تلملاتے ہوں گے کہ مجھ سے میری آخری تحریر، میری پسندیدہ عبارت آخر کیوں چھین لی گئی ہے۔ جس رجعت پسندی کے خلاف میں لکھتا رہا اس سے آخر کیونکر شکست تسلیم کرلوں؟ دل ہی دل میں کہتے ہوں گے...... یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے؟

منٹو کا سچ ان کا احساس ان کا اپنا منفرد سوچنے کا انداز صرف انہی کا اثاثہ تھا۔ ہم میں سے کسی کو کوئی حق نہیں پہنچتا تھا کہ ہم ان سے ان کا سچ چھین لیں۔ انہیں پورا حق پہنچتا تھا کہ وہ اپنی آخری آرام گاہ پر اپنی پسند کی تختی لگوا سکتے۔ یہی کتبہ کسی اور مغربی ملک کے ادیب نے لکھوایا ہوتا تو سب اس کی تعریف کرتے، بڑھ چڑھ کر اسے سراہتے۔ اپنی روشن خیالی ثابت کرنے کے لیے اس کے ساتھ تصویریں کھنچواتے، پھولوں سے اسے سجاتے سنوارتے، منٹو صاحب خود زندگی بھر جھوٹ اور منافقت کی دھجیاں اڑاتے رہے اور آخر میں جیت منافقت کی ہی ہوئی، ان کی نہیں۔ افسوس، صد افسوس۔

ان جیسا نبض شناس، حساس، غیر معمولی ادیب، اردو ادب کو کم ہی نصیب ہو سکا ہے۔ ان کے ماتھے پہ جڑی ایک تیسری آنکھ بھی تھی جس سے وہ دکھیاریوں، کم نصیبوں، مظلوموں کے دلوں کے اندر کی دنیا میں جھانک لیتے تھے۔ ان کی اسی قابلیت اور طاقت نے انہیں دنیا کے بڑے ادیبوں کی صف میں لا کھڑا کیا تھا۔

وہ اردگرد کی غلاظتوں سے ہیروں جیسی کہانیاں چن لینے کی ایسی قابلیت رکھتے تھے جو کم ہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ انہیں تقسیم ہندوستان کے سیاسی حالات ومحرکات سے زیادہ اس نازک دور سے گزرنے والوں کی خون آلود داستانوں میں زیادہ دلچسپی تھی اسی لیے بٹوارے کے موضوع پر انہوں نے جو کچھ لکھا ادب عالیہ قرار پایا۔ انسانوں کی ٹوٹ پھوٹ، شکست وریخت، ان کی کہانیوں کا موضوع بنتی رہی اور عظیم ادب پارے منظر عام پر آتے رہے۔ افسوس منٹو صاحب گزر گئے مگر ظلم وستم کا دور ابھی تک گزر رہا ہے اور ہم اسے گزار رہے ہیں۔ آج اس معاشرے میں منٹو کی کہانی کے پاگل اور ظالم کھلے پھر رہے ہیں۔ ہر طرف بربریت اور دیوانگی کا دور دورہ ہے۔ مختاراں مائی جیسی عورتیں گینگ ریپ ہو رہی ہیں ۔ فاخرہ یونس جیسی خوبصورت لڑکیاں تیزاب سے جھلسے چہرے لیے بلڈنگوں کی چھٹی منزل سے چھلانگیں لگا کر خودکشی کر رہی ہیں اور ان کے مجرم سکھ چین سے اپنے گھروں میں بیٹھے ٹی وی پر معزز بنے انٹرویو دیتے نظر آرہے ہیں۔ انصاف کہیں ڈھونڈنے سے نہیں ملتا ہمیں آج منٹو جیسے حساس، کاٹ دار ادیب کی پہلے سے بھی زیادہ ضرورت ہے کیونکہ ہم جیسے آج کے ادیب تو مطلبی اور موقع پرست ہیں۔ کردار سے عاری لوگ ہیں۔ مریل چوہے ہیں، ہم میں منٹو جیسی طاقت اور سکت کہاں، منٹو اردو ادب کا وہ سورج دیوتا ہیں جن کی طرح چہرہ اونچا کر کے دیکھیں تو آنکھیں چندھیا کر رہ جاتی ہیں اور دیکھا نہیں جاتا۔ وہ بلند و بالا دکھتے ہیں اور ہم خود کو بونا سا محسوس کرنے لگتے ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ منٹو عالم بالا سے نیچے کو جھانک کر ہمارے معاشرتی انحطاط اور پستیوں میں گری زندگی کا مشاہدہ کر کے، بڑی بڑی کہانیوں کی سلیں اٹھائے، خدا کے حضور کھڑے ہوئے پوچھتے ہوں گے۔

''میرے عظیم تخلیق کار بنی آدم کی اس گنجلک کبھی نہ سلجھنے والی کہانی میں کوئی نیا موڑ آخر کب آئے گا؟''

جنت کی کسی سرسبز وادی میں وہ پھولوں کے کسی خوشبودار تختے کے قریب بیٹھے، اپنی دبیز شیشوں والی عینک کے پیچھے سے ہمیں مسکرا کر دیکھتے اپنی شراب کی خالی بوتل کو دور پھینک کر کہہ رہے ہوں گے۔

''لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں۔'' واقعی منٹو جیسا ادیب ہمارے ہاں دوبارہ کہاں پیدا ہوگا۔

آپ ہیں کون؟......ڈاکٹر انوار احمد

ڈاکٹر مختار عزمی/لاہور

ایک شخص کسی محفل میں تقریر کر رہا تھا۔جوشِ تقریر میں کہنے لگا" آج میں جو کچھ بھی ہوں،اپنے استادوں کی وجہ سے ہوں" مجلس میں سے ایک اور شخص نے آوازہ کسا"۔۔۔۔۔۔۔آپ ہیں کون؟"۔۔۔ہم بھی جوشِ عقیدت میں یہ کہنا چاہتے تھے کہ ہم جو کچھ بھی ہیں اپنے استاد ڈاکٹر انوار احمد کی وجہ سے ہیں۔۔۔لیکن ڈرتے ہیں کہ کہیں کوئی یہ سوال نہ کر ڈالے......" آپ ہیں کون؟"

ہم نے کوئی بارہ برس قبل یہ لطیفہ ڈاکٹر صاحب کی زبانی سنا اور تب سے اب تک اس کا جواب ڈھونڈ رہے ہیں۔ابھی تک اس کا جواب نہیں ملا،حالانکہ بارہ برس کے اندر تو بندہ بہت کچھ کھٹ وٹ لیتا ہے۔سوال بہت مشکل اور پیچیدہ ہے۔۔۔"آپ ہیں کون؟"

ہم تو بہت چھوٹے ڈاکٹر ہیں،اس سوال کا جواب تو ڈاکٹر اقبال جیسا حاضر جواب بھی نہ دے پایا تھا اور کہہ اٹھا تھا

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں ، و اللہ نہیں ہے

کئی بارہ برس گزر گئے مگر اب بھی اگر سمجھ میں آیا تو صرف اتنا کہ ہم کون ہیں۔۔CONE۔۔یعنی ایک مخروط۔۔ایک طرف سے کشادہ اور دوسری طرف سے مختصر۔۔۔۔۔ہمارے بڑے واقعی بڑے تھے اور ہم بہت چھوٹے ہیں۔جو اخلاق و کردار ہمارے اساتذہ کا تھا،ہم اس سے محروم ہیں۔جو محنت اور جدوجہد ہمارے لائق اساتذہ کرام کا حصہ تھی،ہمارا دامن اس سے خالی ہے۔آگے ہمارے شاگردوں کا نجانے کیا حال ہو گا؟۔۔۔۔۔کون بتائے کہ کون CONE کہاں پہ جا کے ختم ہو جائے گی؟۔۔۔۔۔۱۰۰ کی اُلٹی گنتی کا خاتمہ صفر پہ ہو سکتا ہے اور صفر سے نیچے منفی درجات بھی ہو سکتے ہیں۔چلیے ڈاکٹر انوار احمد سے دوبارہ پوچھتے ہیں" ڈاکٹر صاحب!ہم مخروط کے کس مقام پر کھڑے ہیں؟ کھڑے بھی ہیں یا ٹیک لگائے بیٹھے ہیں یا لیٹ گئے ہیں؟"

کہتے ہیں کہ علم کے حوالے سے دنیا میں چار طرح کے لوگ ہوتے ہیں

ایک وہ۔۔۔جو کچھ جانتے ہیں۔۔۔اور یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ کچھ جانتے ہیں۔ایسے لوگ دانا و بینا ہوتے ہیں،ان سے راہنمائی حاصل کرنی چاہیے۔

دوسرے وہ۔۔۔جو کچھ جانتے تو ہیں مگر یہ نہیں جانتے کہ وہ کچھ جانتے ہیں۔ایسے لوگ معصوم ہوتے ہیں،ان سے پیار کرنا چاہیے۔

تیسرے وہ۔۔۔جو کچھ نہیں جانتے مگر اتنا جانتے ہیں کہ وہ کچھ نہیں جانتے۔ایسے لوگ طالب علم ہوتے ہیں،ان کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔

چوتھے وہ۔۔۔جو کچھ نہیں جانتے اور یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ کچھ نہیں جانتے۔ایسے لوگ جاہل ہوتے ہیں،ان کی صحبت سے بچنا چاہیے۔

ڈاکٹر انوار احمد کو اللہ تعالیٰ نے پہلا مقام عطا کیا ہے۔۔ان کے سینکڑوں شاگرد دنیا بھر کی مختلف جامعات اور کالجوں میں اہم مناصب پر فائز ہیں۔آپ کے زیرِ نگرانی تقریباً ۲۵ سکالرز پی ایچ ڈی کر چکے ہیں۔۵۰ سے زائد ایم فل اور ۱۰۰ سے زائد ایم اے کے مقالات میں رہنمائی بہم پہنچا چکے ہیں۔۲۷ تصنیفات اور ۳ تالیفات کے علاوہ ۷۰۰ صفحات پر مشتمل ایک ضخیم تحقیقی کتاب "اردو افسانہ۔ایک صدی کا قصہ" بھی شائع ہو چکی ہے۔

گریڈ سے کسی شخص کی حقیقی عظمت کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔کچھ لوگ گریڈ سے پہچانے جاتے ہیں اور کچھ لوگوں سے گریڈ پہچانا جاتا ہے۔بہرحال ۲۱ ویں گریڈ میں ڈاکٹر انوار احمد کا "میری ٹوریس پروفیسر" کی حیثیت سے تقرر،اساتذہ برادری کے لئے باعثِ افتخار ہے۔

ڈاکٹر انوار احمد کی دلربا شخصیت کے اتنے مختلف اور منور گوشے ہیں کہ مختصر وقت میں اُن کا احاطہ ممکن نہیں۔نا جانے کس نے اور کب کہا تھا کہ وہ ایک مرد ہو کر بھی مرید قسم کے شوہر ہیں،البتہ بہت پیار کرنے والے باپ ہیں۔یاروں کے یار ہیں،بڑے دل بہار ہیں،ادب کا سنگھار ہیں اور علم و عمل کا معیار ہیں۔اسی لیے ترکی اور جاپان جا کر بھی لوٹ آئے ورنہ ڈاکٹر اے بی اشرف کی طرح ترکی اور یورپ میں خدا کی شان اور حسن لامکان دیکھنے کے بڑے مواقع تھے۔

ڈاکٹر انوار احمد کا اندازِ تدریس ایسا پرکشش، معلومات افزاء اور موضوع کا احاطہ کیے ہوتا ہے کہ طلبا و طالبات کبھی بھی بور نہیں ہوتے۔جی چاہتا ہے کہ وہ بولتے رہیں اور ہم سنتے رہیں۔مکالمات کی خوبصورتی اور برجستگی اُن کا خاص ہنر ہے۔۔۔۔۔ایک طناز ادیب کی حیثیت سے اُن کا فقرہ نہایت جاندار،مختصر اور برمحل ہوتا ہے۔اس فقرے کا ایک لفظ بھی اِدھر اُدھر ہو جائے تو گویا موتیوں کی مالا ٹوٹ جائے گی۔لفظ لفظ

منتخب، گندھا ہوا اور معنی آفریں۔ ڈاکٹر انوار احمد کے طنزیہ اور پُر مزاح فقرے تو اَب اقوالِ زریں کا درجہ اختیار کر چکے ہیں۔ ایک پیراگراف ملاحظہ فرمایئے جس میں وافر مطالعہ اور ایک پختہ فکر کی جھلک نظر آئے گی۔

''بعض ماہرین نفسیات نے شاعروں ادیبوں کے طبعی اور ذہنی عوارض کی ایک طویل فہرست تیار کی ہے۔ رسکن بدصورت تھا، بادلیئر نامرد تھا، ژاں ژینے بولو براز میں دلچسپی لیتا تھا، بائرن جنسی عمل کا دلدادہ تھا، آسکر وائلڈ امرد پرست تھا، دوستوفسکی کو مرگی کے دورے پڑتے تھے اور میراجی خودلذتی کا قائل تھا۔ اس سے یہ مغالطہ جنم لیتا ہے کہ ہر بدصورت جنس زدہ، افیونی یا اپاہج شخص ادیب ہوتا ہے۔۔۔۔۔اس سلسلے میں یہ واضح ہو جانا چاہیے کہ دیوانے اور ادیب میں بنیادی فرق مجبور اور مختار کا ہے۔ ادیب ذمہ داری کی صلیب اپنی رضا سے اُٹھاتا ہے۔ یوں ایک طرف اُسے تنہائی کے خلائے بسیط سے رہائی نصیب ہوتی ہے اور دوسری طرف اُس کے وجود میں میخیں گاڑنے والے اس کے تبسم سے لرز اُٹھتے ہیں''۔

ادب کے قارئین کی اقسام بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔فقروں کی بُنت ملاحظہ فرمایئے۔

''ان میں وہ قارئین بھی شامل ہیں جو اپنے اجداد کی ٹوٹی ہوئی تلوار سے کشور کشائی کا عزم رکھتے ہیں، وہ بھی جن کے بھینچے ہوئے تکیے اب بھیگنا چاہتے تھے، وہ بھی جو نامحرم کی سرگوشی میں اپنے وجود کو تحلیل کرنا چاہتے تھے، وہ بھی جو راکھ کو کرید رہے تھے، وہ بھی جو الاؤ سے اپنی مشعل روشن کرنے کے خواہاں تھے، ان میں سے جو داستان کے قاری تھے یا مردہ رگیں جگانے کے لیے زیر علاج تھے، اُن کے لیے بہت سے ڈائجسٹ نکلے، مقبول ہوئے اور اس ملک میں بے پناہ قارئین ملے، جہاں شرح خواندگی شاید اٹھارہ فیصد سے زیادہ نہیں، جہاں چار قسم کے سکول اور نصاب اس لیے ہیں کہ قومی یک جہتی کے موضوع پر زوردار سیمینار ہوتے رہیں۔''

ڈاکٹر صاحب کے حوالے سے یہ مضمون تشنہ تکمیل رہے گا۔ اُن کی کثیر الجہات شخصیت اور کارہائے نمایاں ایک ضخیم مقالے کا موضوع ہیں۔ ڈاکٹر انوار احمد نے مقتدرہ قومی زبان کے صدر نشین کی حیثیت سے مختصر وقت میں نہایت قابل ذکر خدمات سرانجام دی ہیں۔ آخری خبریں آنے تک آپ یونیورسٹی آف گجرات، سیالکوٹ کیمپس کے ڈائریکٹر جنرل ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں ہمیشہ اپنی حفظ وامان میں رکھے۔ آپ نے اُن کا یہ فقرہ پڑھا ہوگا'' جب میں قبرستان جاتا ہوں تو میرے اندر سناٹا گونجنے لگتا ہے''۔ یہ اپنی وضاحت آپ ہے۔ مجھے تو اپنے اندر بھی اس سناٹے کی گونج شدت سے سنائی دے رہی ہے۔ (۲۰۰۵ء/۲۰۱۵ء)

سکول، کالج، یونیورسٹی کے طلبہ اور ریسرچ سکالرز کے لیے ہماری چند کتب

مضامین پطرس	پطرس	-/140روپے
مضامین فرحت اللہ بیگ	مرتبہ: ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی	-/350روپے
چاڑے کی چاندنی	غلام عباس	-/200روپے
مراۃ العروس مع فرہنگ	ڈپٹی نذیر احمد	-/200روپے
اُردو تحقیق صورت حال اور تقاضے	ڈاکٹر معین الدین عقیل	-/700روپے
اُردو ادب کا ارتقاء	ڈاکٹر وحید قریشی	-/150روپے
اُردو تنقید (انتخاب مضامین)	پروفیسر اشتیاق احمد	-/700روپے
اُردو غزل (غزل کی دوسوسالہ تاریخ)	ڈاکٹر یوسف حسین خان	-/800روپے
مقدمہ شعر و شاعری	الطاف حسین حالی	-/200روپے
مقالات اقبال	عبدالواحد معینی	-/400روپے
تنقیدات تحسین فراقی	پروفیسر اشتیاق احمد	700روپے
تنقید اور مجلسی تنقید	ڈاکٹر وزیر آغا	-/300روپے
تحقیق شناسی	ڈاکٹر رفاقت علی شاہد	-/500روپے
اصلاح تلفظ و املاء	طالب ہاشمی	-/250روپے
اُردو کے 25 افسانے	ڈاکٹر اورنگ زیب عالمگیر	-/500روپے
نیا افسانہ اور قاری	ڈاکٹر طاہر تونسوی	-/250روپے
ولی تحقیق و تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر محمد اشرف خان	-/250روپے
فیض احمد فیض (تنقیدی مطالعہ)	ڈاکٹر طاہر تونسوی	-/400روپے
داستان اقبال	آمنہ صدیقہ	-/200روپے

ناشر: القمر انٹرپرائزز، غزنی سٹریٹ اُردو بازار، لاہور 042-37237500

دریا سے صحرا تک......اور جعفر حسن مبارک

ظفر عجمی

سفر روزِ ازل سے بنی آدم کی تقدیر رہا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ سفر میں مضمر تحرک و جستجو کا جذبہ ہی زندگی کے رواں دواں دریا کو معانی و مفاہیم کی نت نئی سرزمینوں سے آشنا کرتا چلا جاتا ہے۔ قصہ آدم کا آغاز جنت سماوی سے کرۂ ارضی کی طرف جس سفر سے ہوا تھا اس کا تسلسل آج بھی جاری ہے۔ یوں لگتا ہے سفر جہاں ایک طرف سماجی اقدار کو متعین ہونے سے روکتا ہے وہیں انفرادی سطح پر شخصی معراج کا ضامن بھی ہے۔ سفر روحانی ہو یا مادی یہ ہمیشہ اپنے ساتھ ترک، ہجرت، مسافرت، تھکن، اُداسی، بیگانگی اور دریافت کے انکشافات لے کر آتا ہے۔

شکار کے زمانے کے جنگلی انسان کی ہیجانی بھاگ دوڑ یا تہذیب و فن کے نمائندہ آج کے فنکار کی تہذیبی سرگرمیاں دفتری آمد و رفت کا جبر ہو یا ستاروں کی تسخیر کا داعیہ تاج و تخت کو چھوڑ کر اپنی روح کی تلاش میں جنگلوں میں بیابانوں کی سال ہا سال کی کٹھن تپسیا ہو یا شہنشاہِ ہفت اقلیم ہو کر آٹھویں سلطنت پر لشکر کشی، مقاصد جدید کے حصول کا سودا ہو یا فقط آوارگی کا استعارہ...... سفر جاری رہتا ہے۔ انسان رک بھی جائے تو سفر جاری رہتا ہے۔

جعفر حسن مبارک کا سفر اس لحاظ سے امتیازی خصوصیت کا حامل ہے کہ یہ اپنے اندر یک رخی ارتکاز کی بجائے اجتماعیت کی دلفریب بہار سموئے ہوئے "دریا سے صحرا تک" پھیلا ہوا ہے۔ اس کی غالب وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ جعفر حسن مبارک خود بھی ہمہ جہت صفات کی شخصیت کا مالک ہے۔ کھیل کی دنیا سے لے کر سماجی، فلاحی، خدمات تک ان کی گوناگوں دلچسپیوں کے ایک جہانِ حیرت کا ہم نے خود مشاہدہ کیا ہے۔ وہ فٹ بال کا قومی سطح کا کھلاڑی رہا ہے اور کالج کے زمانے میں تقاریر، مباحثے اور ادبی سرگرمیاں طلبا کی عمومی سطح سے اسے دانشورانہ امتیاز دلاتی تھیں۔ سماجی سدھار کی وہ تمنا جس نے لڑکپن میں بزم قائد کے پلیٹ فارم پر اس کے دل میں انگڑائی لی تھی آج ایک سماجی خدمت کی علامت کے طور پر شہر فیصل آباد کا اعزاز بن کر جعفر حسن مبارک کی صورت میں اہم ملکی و قومی فورم پر نمایاں ہے۔ ایک سماجی فکری رہنما کے طور پر اس کی تین اہم کتب "علم المعشیات"، "میں نے نشہ چھوڑ دیا" اور "سحر قریب ہے" منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔

'نئے دنوں کے خواب' اس کا شاعرانہ حاصل ہے اور اب بحیثیت سفرنامہ نگار اس کا ایک اور مضبوط تعارف سامنے آ رہا ہے۔

جعفر حسن مبارک کی مزاجی ساخت میں تعلقات بنانے کے ساتھ ساتھ تعلقات نبھانے کا وصف ہمیشہ نمایاں رہا ہے۔ اس کے حلقہ احباب میں داخل ہونے والا ہر نیا دوست چند دنوں میں ہی اس بات کو واضح طور پر محسوس کر لیتا ہے کہ

جن سے مل کر زندگی سے پیار ہو جائے وہ لوگ
آپ نے شاید نہ دیکھے ہوں مگر ہوتے تو ہیں

اسی لیے اس کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کا گراف EFU انشورنس کی ترقی سے بھی زیادہ برق رفتاری سے اوپر کی طرف جا رہا ہے۔ "دریا سے صحرا تک" اس کا سفرنامہ اس مقبولیت میں یقینی اضافے کا باعث بنے گا۔

"دریا سے صحرا تک" کے دورانِ مطالعہ میرے لیے یہ امر خوشگوار حیرت کا باعث رہا کہ جعفر حسن مبارک کا شاید ہی کوئی ایسا دوست ہو جس کا تذکرہ کسی نہ کسی حوالے سے اس سفر میں نہ رہا ہو اور مزید حیرت یہ رہی کہ کچھ جانے پہچانے لوگ جنہیں ہم روز و شب اپنے قریب ہوتے ہوئے بھی کبھی دریافت نہ کر پائے جعفر حسن مبارک نے دیارِ غیر میں نہ صرف انہیں ڈھونڈ نکالا بلکہ پہچان بھی لیا۔ صاحبانِ کاٹ پلٹ اچھی طرح جانتے ہیں کہ عملیات کی دنیا میں ہمزاد کی تسخیر جان جوکھوں کا کام ہے۔ مگر جعفر حسن مبارک نے یہ کام جس آسانی سے کر دکھایا ہے اس کی داد تو وہ شہزاد بیگ سے بھی لے سکتا ہے۔ سفرنامے سے کچھ کلپس ملاحظہ ہوں شاید آپ بھی اپنے ہمزاد کو پہچان لیں۔

"عادل منیر سے ملاقات کے حوالے سے مجھے دکھ صرف اس بات کا تھا کہ دورانِ گفتگو عادل منیر اپنی ذاتی شاعری سنا کر غالباً خود کو متحدہ عرب امارات کے عصری شعرا کی صف میں ایک قد آور شاعر کے طور پر پریذنٹ کرنا چاہتا تھا۔ اپنی اس کوشش میں دورانِ گفتگو اس نے کہا جناب نمونے کے طور پر اپنے کچھ اشعار عنایت فرمائیے تاکہ آپ کی شعری شباہت میرے سامنے آ سکے۔"

میں نے کہا "جناب میری شعری شباہت بھی

وہی ہے جو غیر شاعرانہ شباہت ہے۔ آپ میری اس شباہت کو میری شعری پہچان کے لیے استعمال میں لائیں۔'' اس نے جب دیکھا کہ جعفر حسن مبارک ''غزلو غزلی'' ہونے سے احتراز برت رہا ہے تو مصنوعی ناراضی سے بولا ''اچھا تو پھر میں بھی آپ کو اپنی غزل نہیں سناؤں گا۔'' مجھے محسوس ہوا اپنی مصنوعی ناراضی سے وہ مجھے یہ کہنا چاہ رہا ہے کہ یار اگر اپنی غزل نہیں سنانی...... نہ سناؤ...... جاؤ بھاڑ میں...... مگر کم از کم میری غزل تو سن لو۔''

....

'تھوڑی ہی دیر بعد احمد سرفراز اپنی پٹاری سے باہر آ چکا تھا اور پھر احمد سرفراز نے پانچ سات منٹ میں خود بتا دیا کہ وہ کیا ہے۔''

''کالج لائف سے لے کر تا حال اس کا یہی دستور چلا آ رہا ہے کہ وہ اپنی معلومات کے ذریعے اپنے مخاطب کے حواس پر چھا جانا چاہتا ہے اور اس کی معلومات کی نوعیت ایسی ہوتی ہے کہ عام حالات میں وہ کسی کے خاص کام کی بھی نہیں ہوتی۔ مثلاً عام آدمی کو اس سے کیا غرض ہو سکتی ہے کہ سخت محنت کرنے والے ایک بالغ مرد کو روزانہ چار گیلن تک پسینہ آ سکتا ہے یا یہ کہ بکریوں کے اوپر کے سامنے کے دانت نہیں ہوتے۔''

....

میں شیخ مجیب الرحمٰن ہوں...... بھوپال والا

''یاد نہیں اس وقت پہلی ملاقات پر آپ نے میرا نام سن کر مجھے کیا فرمایا تھا؟ یاد آیا حضور کو؟ چلیے میں یاد دلائے دیتا ہوں۔ آپ نے فرمایا تھا کہ آپ کا نام سن کر مجھے مشرقی پاکستان کا بنگلہ دیش بننا یاد آ گیا ہے۔ حضور میں وہی شیخ مجیب الرحمٰن ہوں۔ بھوپال والا۔''

بوجھل پن کسی بھی تحریر کے لیے زہر سے کم نہیں ہوتا۔ ان چند سطور سے آپ نے یقیناً محسوس کر لیا ہوگا کہ جعفر حسن مبارک نے یہ مشکل مرحلہ جسے سر کرنے کے لیے کوہ پیمائی سے کہیں زیادہ سخت ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے کتنی آسانی اور کامیابی سے طے کر لیا ہے۔ اس کے قلم کی سبک خرامی دریا کی طرح پہاڑوں جیسی سنگلاخ زمینوں میں سنگریزوں سے کھیلتی، رنگا رنگ پودوں اور پھولوں سے چھیڑ کرتی ہوئی آگے ہی آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اس نے بڑی بڑی تلخ سچائیوں کو جس ہلکے پھلکے اور لطیف احساس سے گوارا بنایا ہے اس سے اس کی شاندار حسِ مزاح کے ساتھ اس کے برمحل استعمال کی ذہانت کا بھی اندازہ ہوتا ہے:

اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق
رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں

''میں چونکہ مستنصر حسین تارڑ صاحب کا مستقل قاری رہا ہوں۔ اس لیے یہ اندازہ بخوبی کر لینے کے قابل تھا کہ یہ وہی حسینہ ہے جو اپنا نام اور نیشنیلٹی بدل بدل کر جناب تارڑ صاحب کے ہمراہ اکثر دکھائی دیتی ہے۔ سو اس منظر نامے میں اس حسینہ کے آس پاس ہی کہیں تارڑ صاحب کو بھی موجود ہونا چاہیے تھا۔ میری نگاہیں اس بی بی کے تعاقب میں ایک طرف مرکوز ہوئیں تو مجھ پر کھلا کہ برمودا شارٹس، ٹی شرٹ کے ساتھ چپل پہنے ایک انگریز نوجوان اپنے سیدھے ہاتھ میں دو کوک کے ڈبے دبائے اس کی طرف چلا آ رہا تھا، مجھے گمان گزرا کہ یہ نوجوان بھی عین ممکن ہے جو اپنے ملک و قوم کا مستنصر حسین تارڑ رہی ہو اور کچھ ہی دیر میں یہ بھی کھل گیا کہ اپنے ''ملک و قوم کا یہ تارڑ'' ہمارے تارڑ صاحب سے کہیں زیادہ بے باک بھی ہے۔''

....

آپ کا اسم گرامی؟

''جواب ملا بتا بھی دوں تو آپ کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ نام کا ایک اپنا دھوکہ ہوا کرتا ہے۔ مثلاً کیا آپ کو علم ہے کہ آج جسے آپ ''بنک آف امریکہ'' کے نام سے یاد کرتے ہیں کبھی اس کا اصل نام ''بنک آف اٹلی'' تھا۔

''جناب آپ کا نام جاننے کی استدعا کا مقصد میری طرف سے کوئی فائدہ حاصل کرنے کی کوشش نہیں تھی......''

''بالکل بالکل یہی تو میں کہنا چاہ رہا تھا اگر میں آپ کو فی الوقت یہ بتا بھی دوں کہ بوئنگ 747 ایئر لائنز میں 57285 گیلن ایندھن ہوتا ہے تو آپ کو اس سے کیا ملے گا۔''

''سر میں نے وضع داری کے تقاضے کے پیش نظر آپ کا اسم گرامی دریافت کیا تھا۔''

''بجا فرمایا آپ نے وضع داری کے تقاضے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ مثلاً کوئی شخص کھانا کھاتے ہوئے تقریباً 295 مرتبہ خوراک نگلتا ہے۔ تو بھائی صاحب یہ تقاضے نہ چاہتے ہوئے بھی پورے کرنے پڑتے ہیں۔''

اچھا صاحب اگر آپ اپنا نام نامی پردۂ اخفا میں ہی رکھنا چاہتے ہیں تو میں بھلا اس کے انکشاف پر آپ کو مجبور کرنے والا کون ہوتا ہوں؟

حضور بات یہ ہے کہ پرندے اپنے معدے

کے ذریعے خوراک چباتے ہیں۔ خوراک چبانے کے لیے وہ اپنی چونچ کو زیادہ زحمت نہیں دیتے۔ میں عموماً کوشش کرتا ہوں کہ گفتگو کے دسترخوان پر اپنی چونچ کم سے کم زحمت دوں لیکن آپ مایوس نہ ہوں شاید آپ نہیں جانتے کہ 90 فیصد ریسٹورنٹ اپنے قیام کے پہلے سال ہی ناکام ہو جاتے ہیں۔ کامیابی انہی کے حصے میں آتی ہے جو اپنی کوشش جاری رکھتے ہیں۔

....

اپسراؤں کو سامنے پا کر تو احمد ندیم قاسمی بھی کہہ اُٹھے تھے:

اک حقیقت سہی فردوس میں حوروں کا وجود
حُسنِ انساں سے نمٹ لوں تو وہاں تک دیکھوں

میں تو پھر ٹھہرا ایک معمولی آدمی۔ قاسمی صاحب کے شعری مضمون سے پریرنا پا کر میں بھی حسن انساں سے نمٹنے کے لیے کمربستہ ہو گیا۔ اسی پریرنا سے حوصلہ پا کر میں نے تین کی ٹولی میں شامل ایک سراپا غزل.....عفت مآب بی بی کی طرف سرسری سی نظر کیا کی کہ اس نے جوابی طور پر فوراً آنکھ ماردی۔ میرا اپنے پورے سابقہ کیریئر میں ایسی لچی بی بی سے کبھی ''واہ'' نہیں پڑا تھا۔ میری پیشانی پر پسینہ آ گیا۔ جی میں آئی کہ فوراً اس بی بی کے پاس جاؤں اور اس سے پوچھوں کہ کیا تیرے گھر میں باپ بھائی نہیں ہیں؟''

اس کتاب کو اگر امارات کے مسافروں کی رہنما کتاب بھی کہہ دیا جائے تو بے جا نہیں ہوگا۔ کیونکہ جتنی معلومات امارات کی تعمیر و ترقی سے متعلق اس سفرنامہ میں پیش کی گئی ہیں اتنی معلومات وہاں کا سفر اختیار کر کے بھی شاید ہی کوئی آدمی حاصل کر سکے۔ یہ علمی نکات جس عرق ریزی سے جمع کیے گئے ہیں اس کو صرف وہی لوگ جان سکتے ہیں جنہیں اس دشت کی سیاحی سے کچھ نہ کچھ واسطہ رہا ہو۔ وگرنہ سفر تو ایک تیز رو کی طرح ہوتا ہے جو بہائے لیے جاتا ہے۔

اک تیز تیر تھا کہ لگا اور نکل گیا
ماری جو چیخ ریل نے جنگل دہل گیا

تاہم یہ سب کچھ معلوماتی کتابوں کے نصابی یا امتحانی مزاج سے یکسر ہٹ کر ہے۔ جعفر حسن مبارک کا کمال یہ ہے کہ اس ساری جمع بندی سے اس نے ہمارے سامنے امارات کی جناتی ترقی اور دنیاءِ موجود میں باعزت طور پر زندہ رہنے کی خواہش کے لیے ایک ذہین اور باعزم قیادت کے اندازِ فکر کو بہت ہی خوبصورت انداز میں عیاں کیا ہے۔

پاکستان سے محبت جعفر حسن مبارک کے رگ و پے میں خون کی طرح سرایت کیے ہوئے ہے۔ وہ جہاں بھی جاتا ہے ملکی ترقی کی تڑپ اسے بے قرار رکھتی ہے۔ وہ عمل خیر کو علم و فن کی اساسی قدر خیال کرتا ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر دانش عیاری کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔

اپنے ملک کے لیے، اپنے ملک کے لوگوں کے لیے ترقی اور کامرانی کا خواب دیکھتے دیکھتے وہ اس کی تعبیر ڈھونڈنے نکل پڑا ہے۔ اس کا یہ پہلا سفرنامہ مستقبل قریب کے اس کے بہت سے ایسے سفرناموں کا ابتدائی ہے جو نہ صرف علمی و ادبی اعتبار لیے ہوئے ہوں گے بلکہ وہ ہمارے معاشرے کی فکری توانائی کا باعث بھی ہوں گے۔ ہماری دُعائیں اس کے ساتھ ہیں۔

لبنیٰ صفدر / لاہور

یہ نہیں میری ذات حیرت ہے
اس کی تو بات بات حیرت ہے
دن بھی حیرت ہے رات حیرت ہے
ساری ہی کائنات حیرت ہے
ساتواں در نہیں کھلا لیکن
ہاں مگر شش جہات حیرت ہے
بھید جانے چھپا ہے کیا اس میں
جو کنارِ فرات حیرت ہے
حُسن کو عارضی رکھا اس نے
عشق کو بے ثبات حیرت ہے
ہارنا چاہتی ہوں جس سے میں
ہو گئی اس کو مات حیرت ہے
دیوتا تم ہو داسیاں ہم ہیں
کیوں بنا سومنات حیرت ہے

....

اک نظر محبت کی جس کی یہ نشانی ہے
ہے بدن سنہری تو شال ارغوانی ہے
ورنہ لوگ تو مجھ کو کب کا مار بیٹھے تھے
لے رہی ہوں سانسیں تو تیری مہربانی ہے
فلسفہ محبت کا اب سمجھ میں آیا ہے
اک یہی حقیقت ہے، باقی رائیگانی ہے
آپ کی نگاہوں میں اب مرا بسیرا ہے
صبح بھی حسیں ہے اب، شام بھی سہانی ہے
پھر بھی کنارے تک آ نہیں سکا کوئی
آنکھ کے سمندر میں اس قدر روانی ہے
اک دعا کا سایہ ہے ساتھ ساتھ رہتا ہے
چل پڑی سفر میں تو دھوپ سائبانی ہے
چھوڑ کر چلا ہے تو قافلے کی مرضی ہے
ہم کو راستوں میں اک شمع بھی جلانی ہے

لاہور کی قدیم ادبی تنظیمیں

محمد ممتاز راشد لاہوری/لاہور

فروغ ادب میں جہاں بڑے بڑے سرکاری وغیر سرکاری ادارے اہم کردار ادا کرتے ہیں وہیں شہروں اور قصبوں میں قائم ادبی تنظیمیں بھی بہت ممد معاون ثابت ہوتی ہیں۔ادب کے بڑے مراکز میں شروع ہی سے لکھنو اور دہلی کے ساتھ شہر لاہور کا نام آتا رہا ہے۔قیام پاکستان سے قبل بھی لاہور میں کچھ ادبی تنظیمیں سرگرم عمل تھیں۔1910ء کے لگ بھگ علامہ اقبال خاص طور پر سال میں ایک طویل ملی نظم سنایا کرتے تھے جس کے حاضرین ایک ہزار سے زائد ہوتے تھے۔علامہ اقبال اندرون بھاٹی گیٹ لاہور کے ماہانہ مشاعروں میں بھی شرکت کرتے رہے۔1930ء کے عشرے میں حلقۂ ارباب ذوق لاہور کی ہفتہ وار ادبی محفلیں بھی منعقد ہونے لگیں اور پھر انجمن ترقی پسند مصنفین (پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن۔پی ڈبلیو اے) کی ہفتہ وار نشستیں بھی۔ماضی میں ادبی محفلیں پانی والا تالاب نزد بارو خانہ مستی گیٹ لاہور اور املی والا تکیہ وغیرہ میں ہوتی تھیں۔میرا باقاعدہ ادبی سفر علامہ ذوقی مظفر نگری (تلمیذ شاعرِ مزدور حضرت احسان دانش) کے حلقہ تلامذہ میں شامل ہونے کے بعد 1976ء میں شروع ہوا تھا۔اس سے قبل میں 1966ء میں سعدی پارک سناپ لٹن روڈ مزنگ میں منعقد ہونے والا ایک بڑا پنجابی مشاعرہ اور فتح گڑھ لاہور میں نامور شاعر اکبر لاہوری کے ہاں منعقد ہونے والے دو مشاعرے سن چکا تھا۔اس دور میں پاکستان رائٹرز گلڈ، پنجاب آرٹس کونسل اور نیشنل سنٹر کی ادبی محفلیں بھی ہوتی رہتی تھیں۔میں نے بعض تنظیموں کے نام سُنے ہیں جن کے مشاعروں وغیرہ میں مجھے شرکت کا موقع نہیں ملا تھا۔ان میں آقا بیدار بخت کا حلقہ ارباب علم، مجلسِ احباب ادب شاہدرہ (قائم شدہ 1998ء) مجلس نمود اردو (ایم اے او کالج) وغیرہ شامل ہیں۔

1976ء میں استاد محترم علامہ ذوقی مظفر نگری کے ساتھ بعض ادبی تنظیموں اور حلقوں کے مشاعرے کا موقع ملا۔علامہ ذوقی کی سرپرستی میں بھی تین ادبی تنظیمیں سرگرم رہتی تھیں۔ان میں ایک "انجمن ترویجِ ادب" دوسری "حلقہ اربابِ دانش" اور تیسری "انجمن محافظین اردو" تھی۔

لاہور کے شمالی علاقہ میں "تیزاب احاطہ" ایریا میں علامہ ذوقی کا چھوٹا سا گھر تھا۔مگر وہ اپنے شاگردوں یا دوستوں کے کسی بڑے مہمان خانے میں مشاعرے کرتے رہتے تھے۔قریب ہی محلّہ سوامی نگر میں ان کے سینئر شاگرد بشیر رحمانی کے گھر کی بیٹھک میں بھی مشاعرے ہوتے تھے۔وہیں 1976ء میں ایک مشاعرہ میرے لیے ہوا۔اس مشاعرہ میں رسمی طور پر مجھے علامہ ذوقی کے حلقہ تلامذہ میں شامل کرنے کا اعلان کیا گیا تھا۔اس سے چند ہفتے قبل بسطامی روڈ پر ہومیو ڈاکٹر نازش نقوی کے کلینک میں ہونے والے ماہانہ طرحی مشاعرہ میں شرکت کے دوران میری علامہ ذوقی سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔

1970ء کے عشرے میں پنجاب آرٹس کونسل کے مشاعرے بھی ہوتے تھے۔میں نے ایسا ایک مشاعرہ 1977ء میں چیئرنگ کراس (فیصل چوک) مال روڈ لاہور میں واقع فری میسن کی قدیمی عمارت میں پڑھا جو علامہ اقبال کے جشنِ صد سالہ کے حوالے سے تھا اور اس کی صدارت فیض احمد فیض نے کی تھی۔کلام سنانے والوں میں احسان دانش، سید ضمیر جعفری، قتیل شفائی، انجم رومانی، منیر نیازی، شہزاد احمد اور دیگر کئی تھے۔نظامت امجد اسلام امجد نے کی تھی۔اُس دور میں الفلاح بلڈنگ مال روڈ لاہور میں واقع "نیشنل سنٹر" میں بھی ادبی محفلیں ہوتی تھیں۔اسکی سربراہ کشور ناہید تھیں۔1970ء کے عشرے میں لاہور کے مختلف علاقوں میں ماہانہ مشاعرے باقاعدگی سے ہوتے تھے۔کرشن نگر (اسلام پورہ) میں حکیم زیبا ناروی طرحی مشاعرے کراتے تھے،سی بلاک ماڈل ٹاؤن لاہور میں عبدالرشید تبسم اپنی وسیع وعریض کوٹھی میں پندرہ روزہ مشاعرہ کراتے تھے۔مزنگ لاہور میں یزدانی جالندھری اور ان کے بیٹے حامد یزدانی مشاعروں کا اہتمام کرتے تھے۔لاہور کینٹ میں خواجہ محمد شفیع دہلوی کے دولت کدے پر مشاعرے ہوتے تھے۔مجھے ان سبھی محفلوں میں شرکت کا موقع ملا اور کئی اہم شعراء سے ملاقاتیں رہیں۔لاہور کینٹ میں علامہ بشیر رزمی کے "حلقہ تخلیق ادب" اور مغلپورہ سوسائٹی سکول میں "حلقہ ارتقائے ادب" کے ماہانہ مشاعرے ہوتے تھے (یہ اب بھی ہوتے ہیں)

"حلقہ اربابِ ذوق" کے مقابل کچھ عرصہ تک "حلقۂ اربابِ غالب" بھی سرگرم رہی۔"حلقۂ اربابِ ذوق کے اپنے بھی دو گروپ رہے۔(یہ سلسلہ 2014ء سے تا حال بھی جاری ہے)" بزمِ ہم نفساں" کی ماہانہ ادبی نشستیں بھی بڑی بھرپور ہوتی تھیں۔یہ کبھی کسی کے ہاں ہوتی تھیں اور کبھی کسی کے ہاں۔1986ء میں مجھے سرفراز سید کے ہاں (جہانزیب بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور) میں "بزمِ ہم نفساں" کی ایسی ہی ایک نشست میں شرکت کا موقع ملا تھا۔یہ بڑی بھرپور نشست تھی۔ان کے انعقاد میں معروف

افسانہ نگار سائرہ ہاشمی کا کردار بنیادی نوعیت کا ہوتا تھا۔

جی ڈی آر (شامان ۔ لاہور) میں افسانہ نگار نصرت علی اپنی تنظیم "تخلیقی فورم" کے زیر اہتمام ادبی محفلوں کا اہتمام کرتے رہتے تھے۔ خواجہ فرید ادبی سنگت کی ادبی محفلیں بھی کسی نہ کسی کے گھر میں ہوتی رہتی تھیں۔ اگلے برسوں میں اس تنظیم کے تحت حکیم سلیم اختر ملک نے بیسیوں محفلیں منعقد کر کے تہلکہ مچایا۔ شاہدرہ لاہور میں اعزاز احمد آذر "مجلس احباب ادب" کے زیر اہتمام مشاعرے کراتے رہتے تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی افتخار مجاز بھی ساتھ دیتے تھے۔ انھوں نے پھر "شام لاہور" کے زیر اہتمام بھی ادبی محفلیں برپا کیں۔ پاکستان ملٹری اکاؤنٹس (پی ایم اے) میں ملازمت کرنے والے اہل ادب نے "حلقۂ ارباب ادب" قائم کر رکھا تھا اور یہ حلقہ بھی مشاعرے کراتا رہتا تھا۔ علامہ بشیر رزمی اس میں اہم کردار ادا کرتے تھے۔ بشیر رحمانی بھی ساتھ ساتھ ہوتے تھے۔ معروف ناشر طاہر اسلم گورا "پاکستان لٹریری اینڈ بکس ساؤنڈ" کے زیر اہتمام مشاعرے اور تقریبات رونمائی منعقد کرتے تھے۔ علامہ اقبال کے شیدائی بھی ہر دور میں اُن کے نام سے منسوب کوئی نہ کوئی فورم قائم کر کے اس کے تحت "اقبالی محفلیں" کرتے رہتے تھے۔

(اب بھی لاہور میں ایسے چار پانچ حلقے قائم ہیں۔)

آؤٹ فال روڈ (سنت نگر ۔ لاہور) میں پروفیسر عاشق رحیل کی تنظیم "گلشن ادب" ماہنامہ مشاعروں کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھی۔ پروفیسر نذر بھنڈر "بزم وارث شاہ" کے زیر اہتمام ماہانہ محفلیں کراتے رہتے تھے۔ ماڈل ٹاؤن لاہور میں ڈاکٹر شہناز مزمل "ادب سرائے" کے بینر تلے مشاعروں کا مسلسل اہتمام کرتی رہتی تھیں۔ اے جی آفس (نزد مزار بابا موج دریاؒ) میں اس دفتر کے اہل ذوق وہاں مشاعرے کراتے رہتے تھے۔ ان میں سائیں اختر لاہوری بھی پیش پیش ہوتے تھے جو استاد دامن کے شاگرد تھے اور لمبی لمبی پنجابی نظمیں لکھتے تھے۔

حلقۂ ارباب ذوق لاہور:

اس قدیمی ادبی تنظیم کے زیر اہتمام آٹھ عشروں سے ہفتہ وار اجلاس جاری وساری ہیں۔ اس حلقہ کی تاریخ کے بارے میں کتابیں بھی لکھی گئی ہیں۔ یونس جاوید نے تو اس موضوع پر ڈاکٹریٹ بھی کی تھی اور کتاب بھی پیش کی۔ اس تنظیم کی سرگرمیوں کے بارے میں جتنا بھی لکھا جائے کم ہوگا۔ ہر اتوار کو اس کے اجلاس پاک ٹی ہاؤس لاہور میں ہوتے ہیں۔ اس کو متحرک رکھنے والوں میں ڈاکٹر امجد طفیل، حسین مجروح، شفیق احمد خاں، غلام حسین ساجد اور ڈاکٹر ضیاء الحسن وغیرہ ہیں۔ اس تنظیم کے ارکان میں اپنے دور کے بھی نامور شعراء اور ادباء شامل تھے۔

اس تنظیم کے ارکان تین سو سے زائد ہیں۔ سالانہ انتخاب بھی ہوتا ہے۔ اسی نام سے ایک گروپ جمعہ کو پاک ٹی ہاؤس میں اجلاس منعقد کرتا ہے۔ اس کو ڈاکٹر غافر شہزاد اور اعجاز رضوی وغیرہ نے متحرک رکھا ہوا ہے۔

انجمن ترقی پسند مصنفین (پروگریسو رائٹرز ایسوی ایشن، PWA) لاہور:

یہ تنظیم قیام پاکستان سے قبل قائم ہو چکی تھی۔ پھر کچھ خدشات کی وجہ سے 1960 کے لگ بھگ حکومت پاکستان نے اس پر پابندی لگا دی جس کے بعد اس سے وابستہ اہل قلم ظہیر کاشمیری، حمید اختر، کنول فیروز ڈاکٹر خیال امروہوی اور ڈاکٹر روالعین یزدک نے "انجمن آزاد خیال مصنفین کی بنیاد رکھی۔ حکومت نے اس پر بھی پابندی لگا دی تو ڈاکٹر کنول فیروز نے "مجلس ارتقائے ادب لاہور" کی بنیاد ڈالی۔ وہ اس کے جنرل سیکرٹری بھی تھے۔

1972ء میں صدر ذوالفقار علی بھٹو کا دور شروع ہوا تھا۔ انھوں نے یہ کہ کر پاکستان کمیونسٹ پارٹی اور انجمن ترقی پسند مصنفین سے پابندی آٹھالی کہ یہ لوگ ہمارا کیا کرلیں گے۔ ان دنوں "پاک کوریا فرینڈشپ تنظیم" کا دفتر میکلوڈ روڈ لاہور پر تھا اور اسلم ناگی اس کے رہنما تھے۔ اسی دفتر میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا احیاء ہوا اور کنول فیروز کو اس کا کنونیئر مقرر کیا گیا۔ پھر وہ جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے۔ تب اس کے اجلاس کسان ہال مزنگ روڈ (نزد چوک صفانوالہ) میں منعقد ہوتے تھے۔ سرکردہ ارکان میں عابد حسن منٹو ایڈووکیٹ، اسرار زیدی، غلام محمد ہاشمی، قمر تسکین، عزیز اثری، حنیف بھٹو، نعیم شاکر ایڈوکیٹ، اکبر راحیل مرزا، کامریڈ تنویر احمد خاں، حمید اختر اور اسلم ناگی ایڈوکیٹ شامل تھے۔ 2010 کے بعد لاہور میں اس تنظیم کے دو گروپ بن گئے ایک گروپ تو کامریڈ تنویر احمد خاں، جاوید آفتاب اور عاصم شجاعی اور دوسرے گروپ کو عابد حسین عابد، مقصود خالد اور زاہد شمس متحرک رکھے ہوئے ہیں۔

مجلس ارتقائے ادب لاہور:

1960ء میں جب انجمن ترقی پسند مصنفین پر حکومت پاکستان نے پابندی لگائی تو اس سے وابستہ افراد نے "انجمن آزاد خیال مصنفین" کی بنیاد رکھی مگر حکومت نے اس پر بھی پابندی لگا دی تو کنول فیروز (مدیر "شاداب" لاہور) نے "مجلس ارتقائے ادب لاہور" قائم کی۔ وہ اس کے جنرل سیکرٹری بھی تھے۔ اس کے اجلاس تب پروگریسو گرلز ہائی سکول رائل پارک (نزد چوک لکشمی میکلوڈ روڈ لاہور) میں ہوتے تھے۔ نمایاں شرکاء تھے: ظہیر کاشمیری، قتیل شفائی، صوفی تبسم، سیف الدین سیف، شہزاد احمد، عبدالحکیم وفا

،یونس جاوید،علی شہزاد رضوی،خان پرویز،اظہر جاوید، ناصر زیدی،خواجہ محمد زکریا،شاہد شیدائی،مظفر بخاری، قاضی اقبال،اسلم آرٹسٹ،جاوید شاہین،ملک بی اے راز(مدیر ماہنامہ "فنکار" لاہور)،طفیل ہوشیار پوری، ارمان عثمانی، علامہ لطیف انور، محمد افضل طور، خان پرویز،اقبال ساجد،ستار طاہر،نسرین انجم بھٹی،کشور ناہید،منور بھائی اور دیگر۔ 1960ء میں گورنر مغربی پاکستان ملک امیر محمد خان نے اس تنظیم پر پابندی لگا دی۔کنول فیروز،ظہیر کاشمیری،جاوید شاہین اور دیگر گرفتار ہوئے۔رہائی کے بعد کنول فیروز نے "بزم ارباب دانش" کی بنیاد رکھی جو کچھ عرصہ بعد غیر فعال ہوگئی۔

کرسچین جرنلسٹ یونین:

اس کی بنیاد مدیر "شاداب" لاہور کنول فیروز نے 1960ء میں رکھی۔اس کے صدر ڈاکٹر جان جوزف کاتھولک بشپ آف فیصل آباد تھے۔نائب صدر ڈاکٹر کے ایل ناصر اور عنایت مسیح بشپ آف لاہور تھے۔جنرل سیکرٹری کنور فیروز تھے۔نائب سیکرٹری یکے بعد دیگرے گلزار چوہان،ڈاکٹر ڈینئل، یونس وریام اور وسیم رازی رہے۔عنایت برنارڈ اور فرانس ندیم اس کے اہم رکن تھے۔

حلقہ ادب:

لاہور میں اسلام پسند اہل قلم نے یہ تنظیم غالب 1974ء میں شروع کی اور کچھ عرصہ کافی متحرک رکھی۔اس کے ارکان میں اسد گیلانی،نعیم صدیقی، تحسین فراقی اور جعفر بلوچ وغیرہ شامل تھے۔

حلقہ تصنیف ادب:

اس کی بنیاد 1974 میں معروف شاعر غضنفر علی ندیم نے لاہور میں رکھی۔اس کے اجلاسوں میں زاہد حسین،امجد طفیل،ڈاکٹر ضیاء الحسن،شفیق احمد خان،اختر شمار،اظہر غوری،نصیر احمد، پروین تجل، فاطمہ غزل، صائمہ الماس، حسن بانو،سعید قریشی،سعد اللہ، نگار آزاد مہدی اور تسنیم تصدق وغیرہ شریک ہوتے تھے۔ تسنیم تصدق پھر اسلام چلی گئی اور 2018ء میں بھی وہ اس تنظیم کو کسی حد تک قائم رکھے ہوئے ہیں۔

پنجابی ادبی سنگت اور پنجابی سنگت پاکستان لاہور:

حلقۂ ارباب ذوق اور انجمن ترقی پسند مصنفین کی طرح "پنجابی ادبی سنگت" بھی ہفتہ وار ادبی نشستوں کے انعقاد میں خوب سرگرم تھی اور اور ظاہر ہے کہ وہاں پنجابی زبان کے ادب ہی کو اہمیت دی جاتی تھی۔بعد میں ایسی ہی ایک تنظیم "پنجابی سنگت، پاکستان" بھی بنی اور ہفتہ وار اجلاس کرنے لگی۔ دونوں تنظیمیں تاحال خوب سرگرم ہیں۔اول الذکر کے اجلاس "چوپال کیفے" ناصر باغ لاہور میں اور مؤخرالذکر کے اجلاس پنجاب لٹریچر،آرٹ اینڈ کلچر سنٹر (پاک)نزد قذافی سٹیڈیم لاہور میں ہوتے ہیں۔

میں نے 1994ء میں "ادارۂ خیال وفن" قائم کیا۔تب میں قطر میں تھا اور جنوری 1995ء سے اس کے تحت سہ ماہی ادبی رسالہ "خیال وفن" بھی جاری کیا جو لاہور اور دوحہ سے بیک وقت شائع ہوتا ہے(اب 24 سال بعد بھی یہ جاری ہے)۔ادبی تنظیم ادارۂ خیال وفن" کے زیر اہتمام قطر میں ہم نے بیسیوں تقریبات کرائیں۔لاہور آتا تو یہاں بھی مشاعرے وغیرہ کراتا تھا تب بیسویں صدی کے آخری سال تھے۔

غرضیکہ لاہور میں بیسویں صدی کا نصف آخر اور خصوصی طور پر "ربع آخر" ادبی سرگرمیوں میں تسلسل اور شدت کے اعتبار سے بہت کامیاب دور تھا۔اکیسویں صدی شروع ہوئی تو کچھ پرانی تنظیمیں کمزور پڑ گئیں یا اپنا وجود کھو بیٹھیں اور کئی نئی تنظیمیں ابھر آئیں۔ان کا احوال پھر سہی۔

مولانا حامد علی خاں کی یاد میں شاہد علی خاں کی زیر ادارت شائع ہونے والا مجلّہ

الحمراء

ادبی صحافت میں مقبولیت کے سنگ میل عبور کرتا ہوا گزشتہ پندرہ برس سے ہر ماہ باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے

اپنے ادبی ذوق کی تسکین کے لیے بک سٹال سے طلب فرمائیں یا ہم سے براہِ راست منگوائیں

رابطہ کے لیے دفتر ماہنامہ الحمرا: j-24 ماڈل ٹاؤن، لاہور 0333-4001844

"ہو گیا ہم کو پیار صاحب سے"

محمد امین ساجد سعیدی/حاصل پور

"ہر شے تری حامد ہے کہ محمود ہے تو"

کائنات کی ہر شے رب کائنات کی حمد بیان کرتی ہے۔اس کی تعریف و توصیف کے نغمے الاپنے میں ہمہ وقت مگن ہے۔جو اپنے اپنے انداز بیان اور اپنے اپنے رنگ میں اس کے نام کی مالا جپتے ہیں۔

لیکن انسان اشرف الخلوقات ہونے کی علت و منصب کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کی حمد، تسبیح و تحلیل میں مصروف عمل ہے۔انسان رب کائنات کی توفیق سے چاہے تقریر کی صورت ہو تحریر کی صورت جس کو خدائے رحمٰن نے اپنا تلمیذ الرحمٰن کہا ہے وہ قوافی و ردائف کے حُسن سے الفاظ کے موتی عقیدت کی انگوٹھی میں جڑتا چلا جاتا ہے جس سے شعر و سخن میں وحدت کے خوبصورت رنگ نظر آتے ہیں۔

حسن عباسی صاحب نے بھی اپنی پاکیزہ کاوش و کوشش کی اور حمدیہ دیوان 'صاحب' کے عنوان سے تخلیق کر کے خدا کے قرب کی سعادت سے بہرہ مند ہوئے ہیں۔

وطن عزیز میں عصر حاضر میں تقریباً 65 کے قریب حمدیہ دیوان شائع ہوئے ہیں۔حسن عباسی 66 ویں حمدیہ دیوان میں 437 اشعار سہل کاری اور آسان و سادہ پیرائے میں عمدہ ترین شہکار و اظہار ہیں۔جدت ادا، خیال کی آفرینی، طرز بیان کا بانکپن، تراکیب سازی، انگریزی الفاظ کی آمیزش اور شاعرانہ پیکر تراشی سے 15758 الفاظ "صاحب" کے ورق ورق میں مسطور ہیں۔6 بحروں میں بہت حسین ترین حمدیہ گلدستہ قابل تحسین ہے۔درود تاج اہل تصوف اہل عقیدت اور اہل عشاق کے اوراد و وظائف میں شامل و کامل ہے جس میں "صاحب" کا لفظ محبوب دلبراں، جانِ عاشقاں شاہ دو جہاں علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لیے نہایت حسن لطافت اور خوبی کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے۔

صاحب التاج والمعراج صاحب قاب قوسین صاحب الجود والکرم اس میں جہاں "صاحب" بڑی گیرائی و گہرائی اور معنویت رکھتا ہے وہاں بزرگ کا لفظ بھی اسی مقام پر مرقوم ہے۔اس کے علاوہ بہت سے مقامات پر سرورِ کونین ﷺ ہے 'صاحب' کا لفظ عقیدت و احترام سے سجایا گیا ہے۔آقا پاک ﷺ کے صفاتی نام، رؤف، رحیم، کریم، اول آخر ظاہر، باطن، حکیم اور بہت سے نام اللہ تعالیٰ کے اسمائے گرامی صفاتی حسن میں نظر آتے ہیں یا یوں کہیے کہ رب تعالیٰ کی صفات کے جلووں کا ظہور اس کے محبوب کی اداؤں سے ہوتا ہے۔

متذکرہ بالا سطور میں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے لیے "صاحب" کا لفظ اہل سلوک اور اہل نظر نے ادا کر کے اس دال کو ثبت کر دیا ہے کہ

رب کائنات کے لیے بھی صاحب استعمال کیا جا سکتا ہے۔حسن عباسی صاحب علم، قادر الکلام اچھوتے پن کا متقدمین و متاخرین شعرا کی ڈگر پر چلتے ہوئے خوب سیرت شاعر ہے۔اس کے پیش نظر جہاں رب کائنات کی عظمتیں و رفعتیں اور کروڑہا صفات و تسبیحات ہیں وہاں اس کی وادیٔ تصور میں موسیٰ علیہ السلام کی قوم کا وہ آدمی ہے جو رب تعالیٰ سے یوں کہتا ہے کہ اے میرے اللہ تو میرے پاس ہوتا میں تیرے بال سنوارتا میں کنگھی کرتا۔ تجھے کھانا کھلاتا، تجھے نہلاتا، تیری خدمت کرتا، حمد کا مضمون نعت کی نسبت آسان ہے۔

با خدا دیوانہ باشد، با محمد ہوشیار

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر،
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

انسان اپنی ماں سے بلا جھجک اور بغیر کسی خوف اور ڈر کے اپنا حال دل بیان کر دیتا ہے لفظ ماں آ جائے تو سارے فلسفے اپنی جگہ تمام حجابات اُٹھ جاتے ہیں۔ ماں کی محبت کو میاں محمد بخش نے بہت سے مقامات پر خوب خوب بیان کیا ہے۔صرف ایک شعر سے اس کیفیت کی لذت کشید کرتے ہیں۔

سیاں نال پانی نوں گئی تے ٹٹ گھیاں میریاں ونگاں
ماں ہندی تے ہور چڑھاندی باپ کولوں کیویں منگاں

یوں مصرع یوں بھی ہے:

ماں ہندی تے ہور چڑھاندی باپ کولوں پئی سنگاں

اب اللہ تعالیٰ کی پاک بارگاہ کا نظارہ ذرا چشم تصور سے کیجیے کہ جو فرماتا ہے کہ میں ستر ماؤں سے زیادہ اپنے بندے سے پیار کرتا ہوں۔بس حسن عباسی جس حسن حسین اور تحسین انداز میں اپنے رب صاحب سے ہم کلام ہوتے ہیں اس سے رب العالمین کے قرب کا باب وا ہوتا ہے۔حسن عباسی کے کلام سے خوف، ڈر، ہیبت و دہشت کے تمام دروازے بند ہو جاتے ہیں۔

حسن عباسی صاحب یقیناً وارثانِ محراب و ممبر کے تمازت آمیز فتاویٰ سے باخبر ہے جن کی زد اور لپیٹ سے علامہ اقبال نہ بچ سکا ان کے گلے میں بھی کفر کا پروانہ ڈالا گیا۔

کیونکہ کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

اسی لیے اقبال نے بھی احباب فتاویٰ کے لیے ملا کا لفظ استعمال کر کے خوب خبر لی ہے۔ سلطان العارفین فرماتے ہیں:

پ پڑھ پڑھ عالم کرن تکبر حافظ کرن وڈیائی ہو

سلطان العاشقین خواجہ غلام فرید فرماتے ہیں:

ملا نئیں کہیں کار دے
شیوے نہ جانن یار دے

مولانا روم فرماتے ہیں:

مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم

اور حسن عباسی اسی راہ ہموار پر چلتے ہوئے کہتے ہیں:

آپ کے گھر میں زور تو ملا کا چلتا ہے
ننھے فرشتے بن جاتے ہیں مرغے صاحب

حسن عباسی کے کلام پر تبصرہ اپنی رائے یا مضمون نگاری راقم جیسا بے علم کم مایہ کے بس کی بات نہیں۔ "صاحب" کے آغاز میں جو سخنوری اور علم وادب کے آفتاب و ماہتاب ہیں۔ عہد حاضر نے جن کی عظمت کو سلام کیا ہے۔ شعرا کرام اور شاعرات نے خوب خوب قلم کاری کی ہے اور حسن عباسی صاحب کو زبردست خراج تحسین پیش کیا ہے۔ مجھے یہاں ان کے کلام کو فنی حوالے سے دیکھ کر کچھ عرض گزار ہونا ہے۔

شعرا کرام اپنے کلام میں دوہرا قافیہ استعمال کر کے اپنی مہارت و ریاضت کا ثبوت دے رہے ہیں۔ یہ خوبی اور فن حسن عباسی کے کلام میں بھی جا بجا ملتا ہے۔ انہوں نے ذوالقوافی کے ساتھ ساتھ تہرا یعنی تین قافیے استعمال کر کے اساتذانہ پرکاری کا ثبوت دیا ہے۔ درج ذیل مثالوں سے حظ اُٹھاتے ہیں:

ہم تو بن اُجرت کے دھندہ کرتے ہیں
مال ہوا کرتا ہے سارا صاحب کا
بورا بورے بھر بھر لادا جاتا ہے
روز و شب چلتا ہے آرا صاحب کا
سب نے دیکھا مکان صاحب کا
میں نے دیکھا جہان صاحب کا

سیاق الاعداد

اس صنعت میں شاعر اعداد کا استعمال ماہرانہ بندش سے کر جاتا ہے اور شعر کا وزن بھی متاثر نہیں ہوتا۔ حسن صاحب نے بھی اسی شعر حسن کو مد نظر رکھتے ہوئے خوب تجربہ کیا ہے۔ دو اشعار خاطر نشین کیجیے:

ایک دو تین کی تو بات نہیں
لے رہی ہے قطار صاحب سے
اپنے پر افلاک تلک پھیلاتا ہے
مجھ میں ایک کبوتر رنگلا صاحب کا

حسن عباسی کے کلام میں جہاں برمحل محاورات استعارے، مشاہداتِ فطرت کی نہایت عمیق نظری سے بات کی گئی ہے وہاں جنسی لحاظ سے اپنے تخیلاتی ارتکاز کو بھرپور موزونیت سے نبھایا ہے۔ صنعت تحت النقاط میں ان کے درج ذیل مصرعوں سے ان کی شاعرانہ گرفت اور ذوق طمطراق عیاں ہوتا دکھائی دیتا ہے:

دیواروں پر پھیل گئی ہیں بیلیں صاحب
کس چکر میں آپ دکھائی دیں گے ہم کو
میرے گھر آئی ہے گڑیا صاحب کی
آپ کے سر کی ویل ہے صاحب
پیسے کی ریل پیل ہے صاحب

حسن کے کلام میں جہاں دیگر فنی رموز آشکار ہوتے ہیں ان کے بہت سے مصرعوں میں تجنیس سہ حرفی کا حسن بھی دوبالا نظر آتا ہے۔ چند اشعار دیکھیے:

آپ دریچہ کھول کے میرے کمرے کا
مجھ سے ملنے آئی پروا صاحب کی
کیسے دیکھوں جا کر بنگلہ صاحب کا
چاروں جانب سے ہے جنگلہ صاحب کا
کرنے پڑتے ہیں کام لوگوں کے
رکھنا پڑتا ہے دھیان صاحب کا

ان اشعار میں حسن عباسی صاحب نے ایسے حروف کا چناؤ کیا ہے جو مصرعہ اولا میں حرف کاف سے شروع ہوتے ہیں۔

ان کے کلام کی ایک خوبصورتی تکرار لفظی کی وجہ سے بھی قاری کو اس کے ذوق اور شوق کی طرف راغب اور دلچسپی کے لیے آمادہ کرتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

لحد لحد میں بدن کا سونا
بہت بناتے ہو مال صاحب
بورا بورے بھر بھر لادا جاتا ہے
روز و شب چلتا ہے آرا صاحب کا
سہما سہما سمٹ کے رہتا ہوں
ہر طرف بے شمار ہے صاحب

حسن عباسی کے کلام میں فنی حوالے سے بہت سی سخن سازیاں عیاں ہوئی ہیں۔ مثلاً صنعت تضاد، صنعت تلمیح، تجنیس مذیل، تجنیس محروف وغیرہ۔ سطور کی طوالت کے پیش نظر ان کے بے ربط الفاظ اور بے ترتیب جملوں پر اکتفا کرتے ہوئے اس دعا کے ساتھ اختتام کی دہلیز پر جبین شوق رکھتے ہوئے عرض ہے کہ برادر ذی احتشام حضرت حسن عباسی اس دیوان حمد کو عالمی شہرت دوام اس قبولیت عامہ سے رب حرف و صوف اپنی حفظ و امان میں رکھے آمین

دو وقت کی روٹی

محمد طارق علی

میں بی اے کی ڈگری ہاتھ میں لیے شہر میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ ہر در بند، ہر چوکھٹ پر دربان، ہر افسر بدزبان۔ چلے جاؤ، کوئی نوکری نہیں ہے۔

''مگر صاحب، میرے پاس ڈگری ہے۔''

''تو ہم خالی ڈگری کا کیا کریں؟''

''صاحب ڈگری نہیں، میرا پیٹ خالی ہے۔''

''تو ہم کیا کریں جاؤ، موٹی سی رشوت یا پھر کسی موٹے کی سفارش لاؤ۔''

''صاحب، یہ سب میرے پاس نہیں ہے۔''

''تو پھر بھاگو یہاں سے، ہمارا وقت ضائع نہ کرو۔'' ہر ترچھے بیٹ، ہر موٹے پیٹ اور منہ میں دبے ہر ٹیڑھے سگار نے مجھے یہی بات کہی۔

یونہی کئی سال تک ناکامیوں نے مجھے گھیرے رکھا۔ تاہم ہر ناکامی پر میں اپنی ہمت کو بڑھا دیتا اور نوکری نام کی ہر چڑیا کے پیچھے بھاگتا رہا لیکن اس چڑیا کے پر گننے کے فن سے میں ناواقف ہی رہا۔ غریب کا بچہ تھا نا، اس لیے۔

ایک روز گرما کی جھلسا دینے والی دوپہر میں ایک سایہ دار درخت کے نیچے کھڑا ہو کر میں پسینہ خشک کر رہا تھا کہ زمین پر لیٹے ہوئے ایک ملنگ نے اپنی نیم وا آنکھوں سے مجھے دیکھا اور کہا:

''کیوں پریشان پھرتا ہے بچہ؟''

''نوکری ڈھونڈتا ہوں، بابا''

''ہاہا، نوکری؟ وہ تو تجھے نہیں ملے گی، کبھی نہیں، جا خود اپنا کوئی کام کر، چھوٹا ہی سہی، لیکن اپنا کام۔''

''بہت بہت شکریہ، بابا'' ملنگ بابا کی بات میرے دل کو لگی اور میں اپنی پرانی سی سائیکل پر سوار ہو کر گھر کی طرف چل دیا۔

پھر میں نے اگلے کئی دن اسی سوچ میں گزار دیے۔ اپنا کام، چھوٹا سا کام، لیکن کون سا؟

اپنے بڑوں سے، دوستوں سے مشورے کیے، بھانت بھانت کی بولیاں سننے کو ملیں۔ ہر بات میں لاکھوں کا ہیر پھیر تھا اور اپنے پاس لاکھوں روپے تو کیا ایک لاکھ ''پیسے'' بھی نہ تھے۔

اور پھر اچانک ایک نئی مصیبت میرے سر پر آن کھڑی ہوئی۔ جس گھر میں میری ''مانگ'' بیٹھی تھی وہ پورا گھر میرے پیچھے پڑ گیا۔

''آؤ اور اپنی امانت کو عزت کے ساتھ ڈولی میں بٹھا کر گھر لے جاؤ۔'' یہ تقاضا کئی بار ہوا۔ میں ٹالتا رہا لیکن پھر بار بار ہونے لگا۔ ہر ہفتے بلکہ قریباً ہر روز، یہاں تک کہ میرے بوڑھے ماں باپ بھی اس تقاضے کی حمایت میں اُٹھ کھڑے ہوئے۔

''ہمیں مرنے سے پہلے اپنی بہو کا منہ دیکھنا ہے اور اپنے پوتوں اور پوتیوں کا بھی، تم جلدی کرو۔''

''لیکن میں تو خود مرنے کے لیے کونا ڈھونڈ رہا ہوں'' میں دل میں سوچتا، لیکن سب کو جواب میں کہتا۔

''ہاں کوشش تو کر رہا ہوں۔ آپ دعا کریں۔ کہیں میرا کام بن جائے۔''

ماں باپ تو دعا کے لیے ہاتھ اُٹھا دیتے لیکن لڑکی والے منہ بنا کر چل دیتے اور پھر ایسا وقت بھی آیا کہ انھوں نے میری مستقل بے کاری اور کنگلا پن دیکھ کر منگنی توڑنے کی دھمکی دے دی۔ گو اس منگنی کی ڈور میں میرا دل بھی بندھا ہوا تھا لیکن اُن دنوں میں اپنے آپ سے اور حالات سے بہت اوازار تھا۔ سو میں نے جی کڑا کر کے کہہ دیا:

''جناب! یہ تو بہت اچھی بات ہے اور اچھی بات میں دیر کیسی؟'' پھر بھی لڑکی والوں نے مجھ پر خوب لعن طعن کی۔ میں چپ کا چپ رہا۔

ایک روز میری نہ ہونے والی بیوی نے مجھے ایک لفافہ بھیجا۔ میں نے کھولا تو اس کی چوڑیاں تھیں اور ایک رقعہ بھی، اُس نے سخت زبان میں لکھا تھا:

''در فٹے منہ، کیا تم مرد ہو؟ اتنا بھی نہیں کر سکتے کہ ریڑھی لے کر پھیریاں ہی لگا لو، اب بھی وقت ہے، یہی کر لو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں، تم سے کچھ بھی نہیں مانگوں گی۔ تم سے دور، تمہاری چاند''

یہ خط نہ تھا گویا تازیانہ تھا۔ سو میں نے ریڑھی تو نہیں، اپنی سائیکل اُٹھائی اور اسی کے ذریعے سپلائی کا کام شروع کر دیا۔ گلیوں، بازاروں میں ہر کریانے کی دکان پر میں حاضری دیتا رہا۔ کام چل پڑا اور دو وقت کی روٹی ملنے لگی۔ میں نے ڈگری تہہ کر کے ایک بکس میں ڈال دی اور ہر موسم کی شدت اپنے اوپر لے لی۔ میرا رنگ وروپ بگڑ گیا لیکن میرا ''یار'' یعنی منگیتر اب مجھ سے بگڑی ہوئی نہ تھی بلکہ بہت خوش تھی کہ میں نے اس کی بات کی لاج رکھ لی اور اُس نے بھی اپنی بات

اس طرح نبھائی کہ ہر کڑوی کسیلی بات کو رد کر کے میرا ساتھ دیا اور بالآخر ایک دن میرے گھر میں ایک چھوٹی سی محفل سجی اور میرے والدین کی آس مراد والا ''چاند'' میرے گھر میں اُتر آیا۔ ایک سجی سجائی ڈولی میں بیٹھ کر۔ ''چاند'' کے لبوں پر کوئی شکوہ نہ تھا بلکہ وہ بہت خوش تھی۔ میرا حوصلہ دوچند ہو گیا۔ میری سائیکل کا پہیہ چلتا رہا، سپلائی کا کام جاری رہا اور دو وقت کی روٹی ملتی رہی۔

ایک روز میں سائیکل پر گھومتے گھامتے شہر سے کچھ دور چمن کالونی جا نکلا۔ یہ ایک نئی بستی تھی، یہاں بیشتر پلاٹ خالی تھے لیکن تعمیر کا کام زور و شور سے جاری تھا۔ میں نے ایک چھپر ہوٹل میں بیٹھ کر چائے پی اور آنکھیں بند کر کے ستانے لگا۔ اُسی ملنگ بابا کی شکل میرے سامنے آ گئی۔

''شاباش، تو ٹھیک جا رہا ہے بچے، لیکن اب تو اپنا کام بدل دے۔ سپلائی کا کام چھوڑ اور ٹھیکے داری شروع کر دے۔ یہیں، اسی جگہ، گھبرانا بالکل نہیں ہمت بڑھا لے۔'' میں نے خیال ہی خیال میں ملنگ بابا کا ہاتھ چوم لیا۔ ''ہاں، ایمان داری پہلی شرط ہے'' میں نے ان کا یہ فرمان دل پر لکھ لیا۔

اور چند ہی روز میں میں نے اپنا سپلائی والا کام سمیٹ لیا۔ چمن کالونی میں آ گیا۔ ایک ناپختہ سڑک کے کنارے دو کمرے کا ایک ادھورا مکان کرائے پر لے لیا۔ بیٹھک میں کرسی میز لگا کر ایک دفتر کھولا، بورڈ لگایا اور اس پر نام لکھا ''ملنگ کنسٹرکشن آفس''۔ مجھے جلد ہی دو جڑواں مکانوں کے ٹھیکے مل گئے۔ اللہ کا نام لے کر کام شروع کر دیا۔ مجھے کنسٹرکشن کی الف بے بھی معلوم نہیں تھی۔ سو چند دوستوں نے اچھے فنی مشورے دیے۔ میں نے ہمت دکھائی اور پھر پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

مجھے اچھی ایڈوانس رقم مل گئی تھی۔ گھر کے اخراجات کے علاوہ میں نے اپنے کام سے متعلق کچھ ضروری چیزیں مثلاً سیمنٹ، ریت، بجری، سریا، شٹرنگ کا سامان خرید کر اپنے آفس کے عقبی حصے میں رکھ لیا۔ باعزت کام تھا، لوگ مجھے ''ٹھیکے دار صاحب'' کہنے لگے۔ سبھی گھر والے مطمئن ہو گئے تھے، گھر میں دو وقت کی روٹی میسر آ گئی تھی۔ خوشی کا ساں آ گیا۔ کبھی کبھی چاند، میری گھر والی، موقع پا کر میرے ہاتھ چوم لیتی۔ ایک مرتبہ میں نے کہا:

''تم ایسا کیوں کرتی ہو، یاد ہے، ایک بار تم نے تحریراً مجھ سے پوچھا تھا ''کیا تم مرد ہو؟''

''وہ غصے کی بات تھی، لیکن تم نے ثابت کر دیا کہ تم واقعی مرد ہو۔ محنت کش مرد۔ اسی لیے میں تمہارے ہاتھ چومتی ہوں۔''

میں مسکرایا ''یہ سب کچھ تمہارے اُسی غصے کی ''برکت'' ہے لیکن اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ایک پہنچے ہوئے ملنگ بابا کی مجھ پر خاص نظرِ کرم ہے۔''

انھی دنوں ایک بڑی خوشی کی بات یہ معلوم ہوئی کہ چار پانچ ماہ سے چاند کا پاؤں بھاری تھا۔ اب اُسے گھر کے طویل اور بوجھل کاموں سے بچانے کی ضرورت تھی۔ میں نے محلے کی ایک غریب لڑکی ''نوراں'' کو کام کاج کے لیے ماہانہ تنخواہ پر رکھ لیا۔ وہ چند ابتدائی جماعتیں پڑھی ہوئی، کافی اسمارٹ اور تیز سی لڑکی تھی۔ اس نے فوراً کام شروع کر دیا۔

ایک روز میں اپنے آفس میں بیٹھا ضروری حساب کتاب میں مصروف تھا کہ ایک اجنبی شخص اجازت لے کر اندر آ گیا۔ کچھ منفرد سی شخصیت تھی۔ منددرا قد، گول مٹول چہرہ، گھنگریالے بال، رنگ سانولا، کنجی آنکھیں، کانوں میں بالیاں، گلے میں سرخ ڈوری والا تعویذ، ہونٹوں پر پان کی مستقل لالی، ایک سلگتی سگریٹ مٹھی میں دبائی ہوئی۔ وہ سلام اور پرسشِ حال کے بعد گویا ہوا۔

''مجھے اختر سیاں کہتے ہیں۔ یہیں، آپ کے پڑوس میں پچھلی گلی چھوڑ کر میرا گھر ہے۔ اسی گھر میں میرا آفس ہے اور ایک سٹور بھی۔ کسی بھی چیز کی طلب ہو، موبائل پر رنگ کیجیے، فوراً مال آپ تک پہنچے گا۔ اعلیٰ اسٹینڈرڈ کی گارنٹی کے ساتھ۔''

اس نے اپنا تعارفی کارڈ میرے سامنے میز پر رکھ دیا۔ میں نے کاروباری انداز میں خوشی کا اظہار کیا اور کہا ''اکثر مال کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔ یقیناً آپ سے رابطہ کروں گا۔'' میرے آفس کے سامنے چھپر ہوٹل تھا، لڑکے کو آواز دے کر چائے منگالی۔

''آپ کا نام اختر ہے، لیکن آپ ''سیاں'' بھی ہیں، کس کے سیاں؟''

وہ ہنس پڑا ''لوگ مجھے سیاں کے نام سے ہی جانتے ہیں۔ جبکہ اختر نام کاغذوں والا ہے۔''

''آپ یہاں کب سے ہیں؟''

''کوئی تین چار ماہ سے۔ پہلے میں حسن ابدال میں یہی کام کرتا تھا۔''

وہ چائے کی پیالی لیے، اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ اُسی کی زبانی معلوم ہوا کہ مختلف عمارتی سامان خصوصاً سیمنٹ کی قیمتیں بڑھنے والی ہیں۔ چند منٹ بعد وہ رُخصت ہو گیا۔ کافی چرب زبان اور تیز آدمی لگتا تھا جبکہ اس کا حلیہ کاروباری لوگوں جیسا نہ تھا۔ مجھے وہ

کچھ اچھا نہ لگا۔

میں نے چار پیسے خرچ کر کے آفس کی شکل بہتر بنالی۔ کارپٹ، عام کرسیوں کی جگہ نئے صوفہ سیٹ، نئی آفس ٹیبل، چھوٹا فرج، ریموٹ والا پنکھا، چھوٹا ٹی وی اور لینڈ لائن والا ٹیلی فون۔ ایک آفس بوائے بھی رکھ لیا۔ دراصل آفس اور اس کا ماحول اچھا ہو تو کاروبار پر بھی اچھا اثر پڑتا ہے۔ سو جلد ہی مزید کلائنٹس آنے لگے۔

میرے ٹھیکے والے دونوں مکانوں پر کام کی رفتار ٹھیک جا رہی تھی لیکن اچانک مارکیٹ میں سیمنٹ شارٹ ہو گیا، پہلے کچھ زیادہ داموں پر ملا، پھر غائب ہو گیا۔ ادھر برسات کا موسم قریب تھا اور میرا دونوں سیٹوں کی ڈبل سٹوریوں پر چھتیں ڈالنے کا پروگرام کھٹائی میں پڑ گیا۔ مختلف معلوم ذرائع سے بھی کچھ نہ ملا، اب کیا کروں؟ مسئلہ اُلجھ گیا تھا۔

ایک دن میں کافی پریشان بیٹھا تھا کہ اختر سیاں میرے آفس آدھمکا۔ منہ میں پان، ایک مٹھی میں دبی سلگی ہوئی سگریٹ، کرتے شلوار میں ملبوس، وہی مخصوص انداز، غیر کاروباری سا خاصا ٹھہرا پن لیے ہوئے۔

"سیاں جی! آپ بہت دنوں میں آئے ہو، کہاں تھے؟" میں نے مسکرا کر پوچھا۔

"بس کاروباری مصروفیات۔ کئی جگہوں پر جانا پڑتا ہے۔ مال لینا اور مال دینا۔" اس نے مٹھی میں دبی سگریٹ کا ایک بھرپور کش لگایا۔

"اس کا مطلب ہے کہ آپ کا سپلائی کا کام بہت اچھا جا رہا ہے۔"

"جی اللہ کا شکر ہے۔ دو وقت کی روٹی مل جاتی ہے۔ آپ نے آفس بہت اچھا بنا لیا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ کام آپ کا بھی ٹھیک جا رہا ہے۔"

"جی اللہ کا کرم ہے۔ ہاں، یاد آیا آج کل مارکیٹ سے سیمنٹ غائب ہے اور مجھے چھتیں ڈالنے کے لیے اس کی سخت ضرورت ہے۔"

وہ ہنس پڑا "واہ سیٹھ صاحب! میرے ہوتے ہوئے آپ پریشان، آپ نے رنگ بھی نہ کیا، کیسے کتنا چاہیے؟"

"یہی کوئی سو توڑے"

"بس؟ میں سمجھا آپ نے ہزار پانچ سو توڑا لینا ہو گا۔ آیئے میرے ساتھ۔"

ہم نے ایک گلی کراس کی تو اس کا مکان آ گیا۔ اس پر "اختر بلڈنگ میٹریل سپلائی سٹور" کا چھوٹا سا بورڈ لگا تھا۔ فرنٹ پر گودام اور پیچھے رہائشی حصہ۔ ہم ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔ اس نے اے سی کھول دیا اور بیل بجائی۔ چند سیکنڈ میں ایک نوخیز لڑکی اندر آ گئی۔ بہت اچھی شکل وصورت، خوب بنی ٹھنی۔

"کچھ چاہیے صاب؟"

"یہ میری ملازمہ ہے، ہمارے ہاں ہی رہتی ہے۔ سلمہ! تم سیٹھ صاحب کی خدمت کرو۔ میں پک اَپ میں سیمنٹ کے توڑے رکھواتا ہوں۔"

وہ اُٹھ کر گودام کی طرف چلا گیا۔ لڑکی کولڈ ڈرنک لے آئی۔ میں نے گلاس خالی کر دیا۔ وہ مسکرائی۔

"صاب! کچھ اور بھی لیں گے؟" لہجے سے وہ کسی پہاڑی علاقے کی لگتی تھی۔

"نہیں شکریہ"

اختر سیاں بل لے آیا۔ اس نے فی توڑا قیمت سو روپے زیادہ کے حساب سے چارج کی تھی۔ میری توقع سے کہیں بڑھ کر۔ بہر حال مجبوری تھی۔ میں نے رقم اس کے حوالے کی اور چلنے کے لیے اُٹھا۔

"سیٹھ جی! یہ بھی آپ ہی کا گھر ہے۔ جب جی چاہے آیئے۔ کولڈ ڈرنک، چائے، کافی یا کوئی اور ڈرنک۔" اس نے آنکھ دبا کر کہا "جیسا آپ چاہیں گے ویسی ہی خدمت ہو گی۔ اگر کچھ بھی نہ لینا ہو، آپ کو تھکن زیادہ ہو تب بھی آ جایئے۔ یہاں اے سی کی ٹھنڈی ہواؤں میں آرام کیجیے۔" اس نے عمدہ کاروباری اخلاق ظاہر کیا۔

"بہت بہت شکریہ"

"نہیں، میں رسماً نہیں حقیقتاً کہہ رہا ہوں۔" اس نے میرا ہاتھ دبایا۔

"بہتر، میں مال لینے آتا رہوں گا مجھے دونوں مکان جلد مالک کے حوالے کرنے ہیں۔" میں اُٹھ کر چلنے لگا تو وہ بھی گیٹ تک میرے ساتھ چلا آیا۔

"دیکھیے! اس پڑوسی کو بھولیے گا نہیں۔ بہت کام کا ہے۔" اس کے پان والے سرخ ہونٹ پھیل گئے اور اس نے سگریٹ کا سوٹا لگا کر دھواں اُگل دیا۔ شوخی والے انداز میں۔ میں پک اپ میں بیٹھ کر اپنے آفس پہنچ گیا اور مال اُتروا لیا۔

گھر میں وائف کی طبیعت خاصی نڈھال تھی۔ اس کی پہلی پریگننسی تھی۔ اس لیے بہت احتیاط کی ضرورت تھی۔ کام کرنے والی لڑکی "نوراں" پچھلے ماہ سے جانے کیوں غائب ہو چکی تھی۔ شاید کوئی اسے اچھی جگہ مل گئی ہو، زیادہ تنخواہ والی۔ بہر حال میں چاند کو اس کے میکے چھوڑ آیا، بہتر دیکھ بھال کے لیے۔

رم جھم کی تال پر برسات کا آبی رقص شروع ہو

گیا۔ ہر سو پانی ہی پانی۔ میں اس چھما چھم سے پہلے دونوں مکانوں کی ڈبل منزلوں پر چھتیں ڈال چکا تھا اور پھر برسات کے بعد ہونا تھا پلستر اور فنشنگ اور یوں دونوں مکان ہینڈ اوور کے لیے تیار۔ میری طبیعت میں ایک سکون اور ٹھہراؤ آ گیا تھا اور اب میں ایک نئے کنٹریکٹس فائنل کرنے کا سوچنے لگا۔

اس دفعہ برسات کچھ زیادہ ہی لمبی ہوگئی۔ ہر سو جل تھل، ہر کام معطل اور جی میں ہل چل۔ میرا کام رُکا پڑا تھا۔ تاہم میں روٹین کے مطابق اپنی مہران میں ٹائم پر آفس آ گیا تھا۔ رقص باراں دیکھتا رہا۔ پورا اخبار کھنگال ڈالا اور ٹی وی بھی دیکھا۔ پھر موبائل پر ایک دو دوستوں سے باتیں کیں۔ دوپہر کے وقت ٹفن کھولا، چھپر ہوٹل والی چائے پی، آفس بوائے پہنچا ہی نہیں تھا۔ شام کے چار بج گئے۔ موبائل پر پہلے چاند کی کال آئی، خوش باش تھی۔ اس کے بعد اسی خاص الخاص شخصیت سیاں جی نے موبائل پر مجھے یاد کیا۔

''سیٹھ جی! اس رنگین موسم میں بھی آپ آفس میں بیٹھے دو اور دو چار کرنے میں لگے ہیں۔'' اس نے قہقہہ لگایا۔

''ابھی آپ ہمارے غریب خانے پر تشریف لائے، چائے کا وقت ہو چکا ہے۔ یہاں اچھے اچھے مہمان بھی آئے ہوئے ہیں۔ گیت چل رہے ہیں، آپ کا دل بہلے گا، نہ بہلا تو میرا ذمہ'' پھر ایک اور لمبا قہقہہ۔

میں بھی ویلا بیٹھا اُبا سیاں لے لے کر تنگ آیا ہوا تھا۔ سوچا چلو اس سے مل ہی آؤں، ہے تو وہ عجیب سی بلا اور اپنی مہران میں اس کے گھر پہنچ گیا۔ قدرے اُونچی آواز میں ڈیک لگا ہوا تھا۔ سیاں جی نے خوش دلی سے مجھے ریسیو کیا اور ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ میز پر کھانے کے لیے بہت کچھ تھا۔ پکوڑے، سموسے، کیک، ایک دو سویٹ ڈشیں، چائے، کولڈ ڈرنکس وغیرہ۔

''بس سیٹھ جی شروع ہو جائیے، سوچنا کیا'' اس کے پان زدہ ہونٹ پھیل گئے۔

چائے اور فواکہات سے فارغ ہوئے تو اس نے بیل بجائی، نصف گھونگھٹ نکالے، ہیجان خیز کپڑے پہنے، ایک نوخیز سی لڑکی اندر آئی۔

''آپ اس سے گپ شپ کیجیے، ہلکا پھلکا ڈانس بھی دیکھیے، میں ابھی آیا۔'' سیاں باتھ روم چلا گیا۔

''صاب جی! سلام'' لڑکی کی آواز کچھ مانوس سی لگی، لیکن اسے فوراً نہ پہچان سکا۔ اس نے گھونگھٹ پلٹا، چہرہ، بہت میک اپ زدہ تھا، مگر پہچانا گیا۔

''ارے نوراں تم، یہاں کیسے؟'' میں حیران حیران اُسے دیکھا کیا۔

''سیاں جی نے دو ماہ پہلے اخبار میں اشتہار دیا تھا۔ میں ان سے ملی، انہوں نے فوراً مجھے پرائیویٹ سیکرٹری رکھ لیا۔ چھ ہزار تنخواہ، کھانا اور پک اینڈ ڈراپ۔ بس تب سے میں ان کے ساتھ ہوں اور ان کے کلائنٹس کا دل بہلاتی ہوں، تین اور لڑکیاں بھی ہیں۔ بس صاب یہ دو وقت کی روٹی کا چکر ہمیں یہاں لے آیا۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''ہوں، ابھی ہم یہ ظاہر کریں گے کہ ایک دوسرے کو نہیں جانتے۔''

اسی وقت سیاں بھی آ گیا۔ ''ارے آپ ابھی تک ویسے کے ویسے ہی بیٹھے ہیں، نوراں میں تمہیں کچھ کہہ کر گیا تھا؟''

''اسے رہنے دیجیے، اسے بخار ہے۔'' میں نے کہا۔

اس نے بیل بجائی۔ اسی سائز اور عمر کی تین لڑکیاں اور آ گئیں۔ ''پسند کیجیے، تینوں پن پیک ہیں۔''

''مگر سیاں! تم تو کہتے تھے کہ سپلائی کا کام کرتے ہو۔ مگر یہ سب کچھ......؟'' میں نے پوچھا۔

''سیٹھ جی! میں نے غلط تو نہیں کہا تھا۔ یہ وہی کام ہے میری دو وقت کی روٹی اسی سے نکلتی ہے۔ بلڈنگ میٹریل والا تو میرا کور بزنس ہے۔ وہ سارا مال دوسروں کا ہوتا ہے۔ کمیشن پر بیچتا ہوں۔ سو کے پیچھے صرف ڈیڑھ دو روپے اس سے کیا ہوتا ہے۔ مشکل سے میرے سگریٹ پان کا خرچ نکلتا ہے۔

معروف شاعر انجینئر ظفر محی الدین کا

دوسرا شعری مجموعہ

گن داجوگی

نہایت اہتمام سے شائع ہوگیا ہے

اس شعری مجموعے کے حوالے سے

اسلم کولسری، پروفیسر عاشق رحیل، ڈاکٹر نوید شہزاد نجم الحسنین حیدر، عائشہ باسط، لیاقت گڈگور، مسعود ملہی، حسن عباسی اور نازاوکاڑوی کی آراء شامل ہیں

صفحات: 368، قیمت: -/750

ناشر: نستعلیق مطبوعات

غزنی سٹریٹ اُردو بازار، لاہور

0300-4489310

شیشہ اور سنگ

سیما پرویز

یہ تب کی بات ہے جب ابھی اس نے خواب گاہ کی دہلیز اُلانگی نہیں تھی۔ اورنج جوس سے لبالب بھرے بلوریں گلاس ٹرے میں لیے خواب گاہ کے باہر ہی کھڑی رہ گئی تھی۔ دبیز پردوں نے اس کے وجود کو ایسے چھپا لیا تھا جیسے ماں اپنے بچوں کے عیب چھپاتی ہے۔

یکایک جیسے تیز آندھی کے جھکڑ چلنے لگے تھے۔ اس کا وجود جیسے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر رہا تھا۔ وقت کا پہیہ اُلٹا گھوم رہا تھا۔ سڑاک...... سڑاک ہنٹروں سے ادھڑتی کسی کی کھال، سردار گلباز خان کی حویلی، ایک سہما کانپتا بارش میں بھیگی کبوتری کی طرح...... سر سے پاؤں تک سفید چادر میں لپٹا کسی مہربان کی اوٹ میں چھپا ایک وجود، کانوں میں سیسہ انڈیلتی ایک آواز...... ننگ خاندان! لے جاؤ اسے ہماری نظروں سے دور ہو جاؤ۔ آج سے تم ہمارے لیے مر چکے ہو۔ نکل جاؤ اس گھر سے آج کے بعد ہمیں اپنی شکل نہ دکھانا۔ ایک شیر جیسی دھاڑ میں فرمان جاری ہوا تھا۔

بیس برس پہلے سردار گلباز خان کی بلند و بالا ستونوں اور شان و شوکت والی حویلی کا پائین باغ بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ چاروں طرف قیمتی صوفے اور کرسیاں گولائی میں رکھے ہوئے تھے۔ ان سے ذرا آگے فرشی نشست کا انتظام تھا۔ دبیز قالینوں میں پاؤں دھنس رہے تھے۔ ان پر بچھی سفید دودھیا چاندنیوں پر جا بجا سرخ، سبز اور اودے رنگوں کے گاؤ تکیے عجب بہار دکھلا رہے تھے۔ شیشے کی میزوں پر کرسٹل کے گلدانوں میں موسمی پھول خوشبو بکھیر رہے تھے۔ روشنی کا ایسا اعلیٰ انتظام کہ چاہو تو گری ہوئی سوئی ڈھونڈ لو۔

سردار گلباز خان نے اپنے پہلے پوتے کی رسم عقیقہ پر اس جشن کا اہتمام کیا تھا۔ اپنے دوستوں اور رشتہ داروں میں نمایاں ہونے اور اپنی دولت و ثروت کی دھاک بٹھانے کے لیے مشہور گانے والی ماہ نور کو بلایا تھا۔ بزرگ ذرا قاعدے قرینے میں تھے لیکن نوجوان رئیس زادے خوب کھل کھیل رہے تھے۔ گرما گرم کبابوں کے طشت آ رہے تھے۔ سنہری نقرئی جاموں میں شراب پیش کی جا رہی تھی۔

یہ سب شان و شوکت دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ پاکستان غریب ملک ہے۔ اس ملک کو آزاد ہوئے پون صدی ہونے والی ہے لیکن آج بھی نواب، وڈیرے، جاگیردار، پیر صاحبان اور فوجی اس ملک کے سیاہ و سفید کے مالک بنے ہوئے ہیں۔ جن لوگوں نے ہجرت کا دکھ جھیلا، پورے پورے خاندان کی جان، مال اور آبرو کی قربانیاں دیں ان میں سے بیشتر کی آنے والی نسلیں تک غربت کے سمندر میں غرق ہیں اور عیش وہ لوگ کر رہے ہیں جن کا اس ملک کو بنانے میں کوئی حصہ نہیں۔

سازندے، زمرد بائی اور اس کی نوچیا آ کر قرینے سے بیٹھتی جا رہی تھیں اور پھر جیسے میر کا شعر مجسم ہو کر نگاہوں کو خیرہ کر گیا۔

وہ آئے بزم میں اتنا تو میر نے دیکھا
پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

چھن چھن کر مدھر آواز پر سب کی پر اشتیاق نظریں اُٹھیں تو پھر اُٹھی ہی رہ گئیں۔ لوگ پلکیں جھپکنا بھول گئے۔ ان کے سانس جیسے سینوں میں رک سے گئے۔ ستاروں کے جھرمٹ میں گویا چودھویں کا چاند طلوع ہو گیا تھا۔

پوتھ سلک کا سفید چوڑی دار پاجامہ (جس میں کہیں کہیں سنہری پھول ٹکے ہوئے تھے) جو اس کی متناسب اور سڈول پنڈلیوں کی شان بڑھا رہا تھا۔ گلابی اور سفید شیفون کی گھیر دار پشواز جس کے گلے اور دامن پر نقشی اور دبکے کا سنہرا کام، گھیرے پر طاؤسی رنگ کی گوٹ، سر پر سفید ستاروں بھرا دوپٹہ، کانوں میں کندن کے راج ہنس جیسی گردن کو چھوتے ہوئے مگر گلے میں کندن کا ہی گلوبند۔ چاند سی پیشانی پر بندیا، سڈول گورے بازوؤں میں کانچ کی چھن چھن کرتی چوڑیاں، کنول جیسے سفید پاؤں میں پازیبیں، پیروں کے ناخن اور ہاتھوں کی پوریں مہندی سے گل اناری ہو رہی تھیں۔ مرد تو مرد چلمن کے پیچھے بیٹھی عورتیں بھی دم بخود دیکھ رہی تھیں۔ یہی سولہ سنگھار کہلاتا ہوگا۔ ہم جو پارلر سے تیار ہو کر آتی ہیں وہ کیا ہے؟

رنگ کیا تھا جیسے میدہ اور سیندور گوندھ کر اس کا پیکر تراشا گیا تھا اور وہ شنگرفی قاتل ہونٹ جو کٹیلی اور ہلکی سی طنزیہ مسکراہٹ لیے ہوئے تھے۔ ان کی کوئی مثال تھی ہی نہیں اور وہ آنکھیں تو بنی ہی اس لیے تھیں کہ جس پر اُٹھیں اسے ہوش و حواس سے بیگانہ کر دیں۔ اللہ تعالیٰ نے بڑی فرصت سے بنایا تھا ماہ نور کو۔ اس نازنین کا نام جس کسی نے بھی رکھا تھا بہت سوچ کر رکھا تھا۔

ماہ نور نے گانا شروع کیا۔ کیا مدھر اور سریلی آواز تھی۔ ناچنے والی نے بھی کمال کا رقص کیا۔ محفل جھوم جھوم اُٹھی۔ بیرے مشروبات کی ٹرے اُٹھائے مسلسل گھوم رہے تھے۔ کولڈ ڈرنک کم اور انگور کی بیٹی زیادہ سرو ہو رہی تھی۔ رقص، آواز اور شراب کے سرور سے نوجوان آپے سے باہر ہو رہے تھے۔ دو تین

گانوں کے بعد رقص کرنے والی بیٹھ گئی تو ماہ نور نے ایک غزل شروع کی۔ دو غزلوں کے بعد ہی لوگ بور ہونا شروع ہو گئے۔ ''بھئی کوئی چلبلا سا گانا سنایئے جس کے ساتھ رقص ہو سکے۔''

سامنے صوفے پر بیٹھا نیوی بلیو شلوار قمیض والا لڑکا اُٹھا اور ہزار کا نوٹ ماہ نور کے سر پر رکھ دیا۔ ماہ نور نے سر جھٹک کر نوٹ نیچے گرا دیا۔

''اس مجسم قیامت کا بھی رقص ہو جائے۔'' لڑکے نے ماہ نور کا ہاتھ پکڑ لیا۔''

''چھوڑیے ہمارا ہاتھ! آپ کو جرأت کیسے ہوئی ہمارا ہاتھ چھونے کی۔'' ماہ نور نے جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

''کمال ہے بھئی! تم کون سی شریف زادی ہو جس کا ہاتھ چھونے سے توہین ہوگئی۔ اب تو مجھے بھی ضد ہو گئی ہے جب تک رقص نہیں کرو گی ہاتھ نہیں چھوڑوں گا۔''

وہ بدتمیزی پر اُتر آیا۔ سب لوگ ہنس ہنس کر اسے شہہ دے رہے تھے۔ اچانک کالے سوٹ میں ملبوس ایک وجیہ لڑکا تیزی سے اُٹھا اور بدتمیز لڑکے کو گھسیٹ کر واپس لایا اور ماہ نور سے معذرت کی۔ ماہ نور ناراض ہو کر اپنی گاڑی میں جا کر بیٹھ گئی۔ محفل بدمزہ سی ہو گئی۔ بصد منت اسے منا کر لایا گیا۔ وہ اس شرط پر واپس آئی کہ وہ اپنی پسند سے گائے گی۔

اس نے ایک غزل شروع کی ''ہم ہیں متاع کوچہ و بازار کی طرح''

وجیہ لڑکے کو لگا جیسے اس کی لمبی پلکوں پر ستارے چمک رہے تھے۔ شاید وہ رو کر آئی تھی۔ لڑکے کا دل دکھی ہو گیا۔ بلاوجہ کسی کو ذلیل کرنا یہ کہاں کی انسانیت ہے۔ وہ کافی دیر کڑھتا رہا۔ اس محفل سے ہی اس کا دل اُچاٹ ہو گیا۔ سردار گلباز خان کے تینوں بیٹوں میں سے سردار شہباز خان سب سے چھوٹا اور لاڈلا بیٹا تھا۔ دونوں بڑے تو باپ کی طرح سیاست، شکار، شراب اور شباب کے رسیا تھے لیکن شہباز ذرا فرق عادات کا مالک تھا۔ ایچیسن سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد ضد کر کے انگلینڈ پڑھنے چلا گیا۔ ایم بی اے کی ڈگری لے کر لوٹا تو Lums میں پڑھانے لگا۔ سردار صاحب اس سے خوش نہیں تھے۔ انہیں اس کی سادہ سی عادات پر اعتراض تھا۔ وہ اسے سیاست میں لانا چاہتے تھے پر اس نے صاف انکار کر دیا۔

شہباز سنجیدہ تو ہمیشہ سے تھا لیکن ادھر کچھ دنوں سے وہ زیادہ ہی خاموش ہو گیا تھا۔ سب گھر والوں نے اس کی غیر معمولی خاموشی کو محسوس کیا اور اس سے خاموشی کا سبب جاننا چاہا۔ پر مصیبت تو یہ تھی کہ اسے خود بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ اس طرح اُداس کیوں ہے؟

اس روز کھانے کی میز پر سب نے اسے گھیر لیا۔ ماں نے بڑے پیار سے پاس بٹھا لیا۔ ''ماں صدقے اتنے چپ چپ کیوں ہو؟ مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے؟ کسی نے کچھ کہا ہے! کوئی نقصان ہو گیا ہے؟''

''نہیں ماں جی ایسا کچھ نہیں ہے۔ آپ کا وہم ہے۔ میں تو ہمیشہ سے ایسا ہوں۔''

بڑی بھابھی شرارت سے بولی ''کوئی لڑکی پسند آ گئی ہے؟''

''بولو نا یار! کچھ تو کہو'' بڑے بھائی نے پیار سے اس کے بال بکھیرے۔

''آپ لوگ مجھے بولنے کا موقع دیں تو بولوں نا! آپ سب نے خود ہی میری خاموشی کو مختلف معنی پہنا دیے ہیں۔ آپ سب کی تسلی کے لیے بتا دوں کہ کوئی بات نہیں ہے۔ آپ کے تمام مفروضے غلط ہیں۔''

رات بستر پر لیٹا تو سب کی باتیں یاد کر کے مسکراتا رہا۔ بڑی بھابھی کی بات پر چونکا ضرور تھا۔ لڑکی پسند آنے یا نہ آنے کے بارے میں تو اس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ پر وہ ایک لڑکی کے لیے دکھی ضرور تھا۔ کتنی معصوم تھی۔ کتنی شرارت تھی اس کے چہرے پر۔ تقدیر نے اسے کہاں لا پھینکا تھا۔ کیا پتہ وہ اپنے ماحول سے خوش ہی ہو۔ میں بلاوجہ اس کے بارے میں سوچتا رہتا ہوں۔ اگر وہ خوش ہوتی تو اس کی آنکھوں سے اتنا گہرا دکھ نہ جھلک رہا ہوتا۔

زیادہ پریشان ہوا تو اپنے بچپن کے دوست اور کزن کے پاس چلا آیا۔ پر اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ بات کا سرا کہاں سے پکڑے۔ ''کیا بات ہے؟'' اسد نے خود ہی بات شروع کی۔ ''کچھ پریشان لگتے ہو۔ مجھ سے کھل کر بات کرو۔ تمہارا دوست بھی ہوں اور بھائی بھی ہوں۔ مجھے معلوم ہے گھر میں سب لوگ تمہاری غیر معمولی خاموشی کو لے کر پریشان ہیں۔''

''یار گھر والے تو ایسے ہی بات کا بتنگڑ بنا رہے ہیں۔ بس آج کل ایک اُلجھن میں گرفتار ہوں۔ شاید تم مجھے اس گرداب سے نکال سکو'' وہ بالوں میں اُنگلیاں پھیرتے ہوئے بولا۔

''میں ہمہ تن گوش ہوں'' اسد ذرا شہباز کے نزدیک ہو کر بیٹھ گیا۔

''پچھلے ماہ کا ہمارے گھر کا جشن تمہیں یاد ہے نا۔''

''ہاں بھئی یاد کیوں نہیں ہوگا۔ کیا زبردست انتظام کیا تھا تایا جان نے۔''

''اس میں ایک گانے والی آئی تھی۔'' شہباز نے بے تابی سے اس کی بات کاٹی۔

''وہ جو گلابی ساڑھی والی تھی''

''نہیں بھئی! وہ جو سفید لباس میں تھی، جو رُوٹھ

کینیڈا
خوابوں جیسی سرزمین

ٹورنٹو، مانٹریال اور اوٹاوا کے مشاعروں میں شرکت

حسن عباسی

نیاگرافال، C.N ٹاور، ریپلیز ایکوریم کے علاوہ
بہت سے دیگر سیاحتی مقامات کی سیر اور ادبی محفلیں

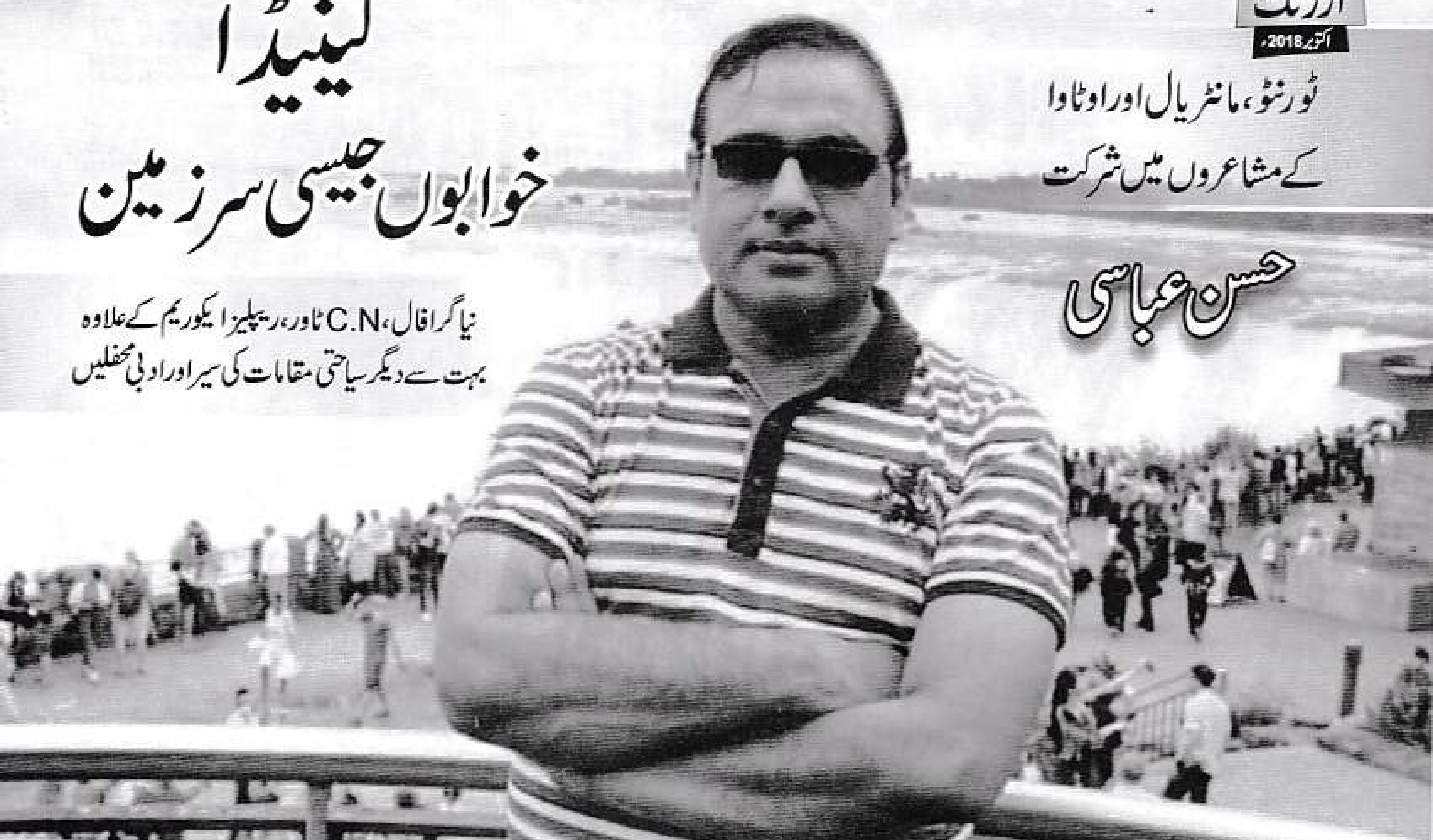

گزشتہ کئی برسوں سے تو یہ معمول بن گیا تھا کہ اگست کا ماہ یورپ کے مختلف ممالک کے عالمی مشاعروں میں شرکت اور سیاحت میں گزرتا۔ گزشتہ برس بھی ناروے، ڈنمارک، اٹلی، فرانس، اسپین اور سوئٹزرلینڈ کے مشاعروں میں بطور مہمان خصوصی شرکت میرے لیے باعث اعزاز رہی۔ اہل یورپ کی محبتوں اور عزت افزائی کو میں کبھی فراموش نہیں کر پاؤں گا۔ اس برس بھی مختلف ممالک سے دعوت نامے آئے ہوئے تھے۔ خاص کر اٹلی میں منعقد ہونے والی اُردو زبان و ادب کے حوالے سے کانفرنس کا دعوت نامہ جس میں دنیا بھر سے نامور ادبی و صحافتی شخصیات شریک ہو رہی تھیں جن میں وسعت اللہ خان اور رضا علی عابدی بھی شامل تھے۔ کانفرنس کے مہتمم جیم فے غوری کے فون بھی مسلسل آ رہے تھے کہ آپ ضرور تشریف لائیں مگر اس بار میرے لیے شریک ہونا ممکن نہیں تھا۔ کیونکہ ایک تو میں کاروانِ ادب مانٹریال (کینیڈا) کے سالانہ مشاعرے کے لیے کمٹ منٹ کر چکا تھا دوسرا کینیڈین ایمبیسی نے مجھے پانچ سال کا جو دل کھول کر ملٹی پل ویزا دیا تھا۔ اس کی مدت ختم ہونے والی تھی اور میں ابھی تک ایک بار بھی نہیں جا پایا تھا۔ سو کینیڈا یاترا کے لیے رختِ سفر باندھ لیا۔ لاہور سے ٹورنٹو کے لیے پی آئی اے کی پندرہ گھنٹے کی ڈائریکٹ فلائٹ کا سن کر دل ڈوبنے لگتا۔ مگر جیسے ہی نیاگرافال کو دیکھنے کا خیال آتا سبھی کلفتیں آسان لگنے لگتیں۔

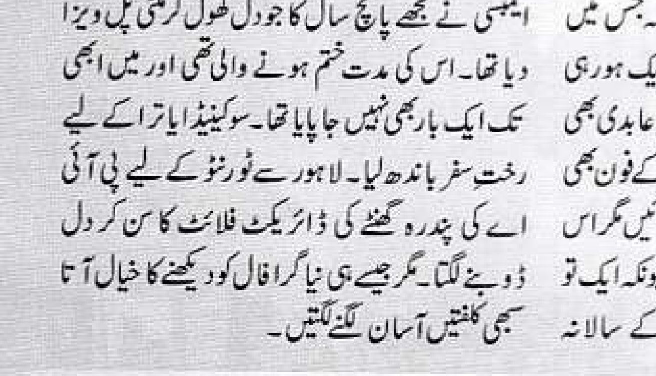

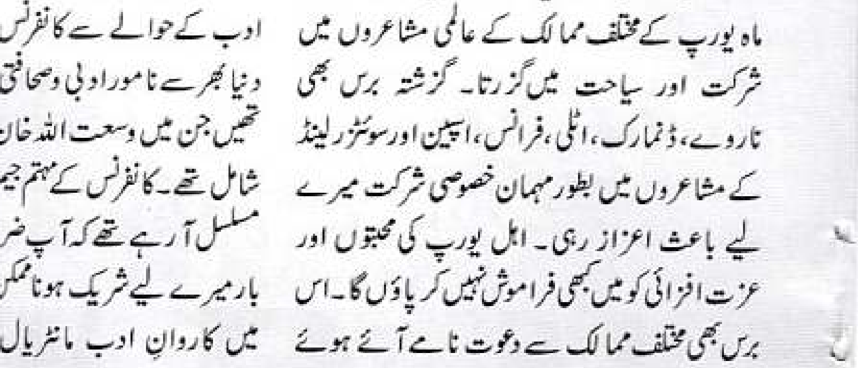

کاروانِ ادب مانٹریال (کینیڈا) کا پانچواں سالانہ عالمی مشاعرہ

ٹورنٹو کے Perason ایئرپورٹ پر امیگریشن آفیسر نے مجھ سے کوئی سوال کیے بغیر چھ ماہ تک رہنے کی انٹری دے دی۔ ایئرپورٹ سے باہر دل پذیر شاعر، خوب صورت انسان اور عزیز دوست جناب جمیل قمر استقبال کے لیے موجود تھے۔ تقریباً 2 گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد وہ مجھے ٹورنٹو سے باہر قدرت کے دل فریب نظاروں میں گھرے ہوئے اپنے خوب صورت گھر لے گئے۔ دیارِ غیر میں گھر جیسا ماحول اور انتہائی لذیذ پاکستانی کھانے ہمارے شاعر دوستوں اور انکے اہل خانہ کے مرہونِ منت ہیں۔ جمیل قمر کی ہمراہی میں 770 WTORam ریڈیو انٹرویو بھی ہوا۔ عارفہ مظفر صاحبہ تک میری شاعری مجھ سے کئی برس پہلے پہنچ چکی تھی۔ پنجابی کے معروف ادیب اور ہم دم دیرینہ عاشق رحیل نے ریڈیو پر انٹرویو سنا تو میسنجر میں ملاقات کا سندیسہ بھیج دیا۔ اگلی صبح مجھے کاروانِ ادب مانٹریال کے مشاعرے میں شرکت کے لیے جانا تھا جہاں اس تنظیم کی صدر تبسم انوار اور جنرل سیکرٹری راشد علی شاہ و دیگر عہدیداران میرے منتظر تھے۔ انہوں نے گاڑی بھیج دی تھی۔ سو540 کلومیٹر کا یہ سفر ایک دلچسپ شخصیت کے حامل انڈین مسلم ڈرائیور کے ساتھ نہایت خوش گوار گزرا۔ تبسم انوار صاحبہ اور راشد

علی شاہ نے بھرپور استقبال کیا۔ اگلے روز جواد شیخ بھی پرتگال سے مشاعرے میں شرکت کے لیے تشریف لے آئے۔ یہاں خوب صورت نوجوان شاعر محمود الحق جو کہ کاروانِ ادب کے نائب صدر بھی ہیں، سے بھی خوب ملاقاتیں رہیں۔ ہمدمِ دیرینہ منشاء اللہ بٹر سے بھی ملاقات ہوئی۔ کاروانِ ادب مانٹریال کا پانچواں سالانہ عالمی مشاعرہ Karnak Shriners میں منعقد ہوا۔ 15 ڈالر کے ٹکٹ کے باوجود 200 کے قریب سامعین موجود تھے جو کہ مانٹریال میں پاکستانی کمیونٹی کی ادب سے گہری وابستگی کا مظہر تھے۔ صدارت اوٹاوہ سے آئے ہوئے بزرگ شاعر اور درجنوں کتابوں کے مصنف ولی عالم شاہین نے کی۔ مہمانانِ خصوصی خاکسار اور جواد شیخ تھے۔ مشاعرے کی شمع خاکسار سے روشن کرائی گئی تو مشاعرے کا آغاز ہوا۔ اگرچہ تبسم انوار صاحبہ کی طبیعت بہت خراب تھی۔ مگر پھر بھی کمال حوصلے سے انہوں نے نہ صرف مشاعرے میں شرکت کی بلکہ نظامت بھی کی۔ اس مشاعرے میں صاحب صدر ولی عالم شاہین اوٹاوہ سے جبکہ جمیل قمر، افضال نوید، رشید ندیم، رفیع رضا، جنید اختر، عظمیٰ محمود، سیما نقوی اور عرفان ستار ٹورنٹو سے تشریف لائے تھے۔ مقامی شعراء سمیت بہت اچھی شاعری سننے کو ملی۔ مشاعرہ بہت کامیاب رہا اور رات گئے تک جاری رہا۔ ڈنر کا اہتمام بھی خوب تھا۔ مشاعرہ سے اگلے روز برنچ کے بعد بھی شعری نشست خوب رہی۔ دیگر شہروں سے تشریف لائے شعراء چلے گئے۔ جواد شیخ اور میں اپنے میزبان راشد علی شاہ کے سپرد ہوئے۔ راشد علی شاہ نے جس طرح ہماری عزت افزائی اور مہمان نوازی کی اور جس قدر ہمیں کینیڈا کی سیر کرائی اُسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ نیاگرا فال، CN ٹاور اور اس کے علاوہ بہت سی جگہیں ان کے سبب یہ دورہ یادگار بن گیا۔ پندرہ دن مانٹریال میں قیام کے دوران سیر و سیاحت کے علاوہ ادبی نشستیں بھی منعقد ہوتی رہیں۔ جن کا وہاں کے مقامی شعراء اہتمام کرتے رہے۔ محمود الحق نائب صدر کاروان ادب نے بھی ایک مشاعرے کا اہتمام کیا۔ ٹورنٹو میں مقیم نسرین سیّد کے شعری مجموعے ''دل دریا'' کی تقریب پذیرائی و محفل مشاعرہ غالب اکیڈمی کے زیرِاہتمام برہمٹن کمیونٹی سینٹر مسی ساگا ٹورنٹو میں منعقد ہوا۔ صدارت ممتاز شاعر اشفاق حسین نے کی۔ مہمانِ خصوصی خاکسار جبکہ مہمانانِ اعزاز جواد شیخ (پرتگال) عرفان ستار، ناہید ورک (امریکہ) اور شوکت جمال (سعودی عرب) تھے۔ تقریب میں مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والی مشہور شخصیات اور شاعروں ادیبوں نے بھرپور شرکت کی۔ کتاب کے حوالے سے مضامین پڑھے گئے۔ مشاعرے میں صرف مہمان شعراء نے اپنا کلام سنایا جسے سامعین نے بہت شوق سے سنا اور ہر شعر پر بھرپور داد دی۔ طاہر اسلم گورا نے TAGTV کے دفتر میں میرے اور جواد شیخ کے

اعزاز میں ایک شعری نشست کا اہتمام کیا جس کی صدارت ٹورنٹو میں مقیم تسنیم عابدی نے کی۔ اس مشاعرے میں کراچی میں مقیم معروف شاعرہ شاہدہ حسن نے بھی بطور خاص شرکت کی۔ اس کے علاوہ عرفان ستار، سلیمان حیدر، عظمیٰ محمود، سیما نقوی، نسرین سیّد، ماہ جبین غزل اور دیگر شعرا نے شرکت کی۔ TAGTV نے ڈنر کا پرتکلف اہتمام بھی کیا ہوا تھا۔ غالب اکیڈمی نے بھی جواد اور میرے اعزاز میں کانٹی نینٹل گرینڈ بوفے ریسٹورنٹ میں تقریب کا اہتمام کیا۔ اسی طرح جمیل قمر نے بھی اپنے گھر ہمارے اعزاز میں ایک محفل مشاعرہ منعقد کی۔

علی گڑھ اوٹاوہ (کینیڈا) میں ایک نہایت فعال ادبی تنظیم ہے۔ اس تنظیم نے بھی میرے اور جواد کے اعزاز میں بہت ہی شاندار اور خوب صورت محفل سجائی جس میں اوٹاوہ کے بہت سے مقامی شعراء نے شرکت کی۔ ڈنر کا نہایت پرتکلف اہتمام کیا گیا۔ اس کے بعد اگلے روز ولی عالم شاہین کے گھر ناشتہ اور ان کی لائبریری جس میں مختلف موضوعات پر لگ بھگ پچیس ہزار 25000 کتابیں ہیں اس لائبریری سے متعلق مختصر تعارف ولی عالم شاہین نے کرایا۔ مانٹریال، ٹورنٹو اور اوٹاوہ میں ریڈیو اور ٹی وی انٹرویوز کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

کینیڈا میں مختلف مقامات پر فالز کی سیر بھی کی۔ کے بک سٹی کا بھی ایک دن کا یادگار سفر کیا اور وہاں تاریخی قلعے کے علاوہ یادگار مقامات دیکھے۔ آخری چند دن ہمدم دیرینہ اور افسانہ نگار سعید میو کی رفاقت میں گزرے۔ دو دن افضال نوید نے ہمارے نام کیے اور ٹورنٹو کے سیاحتی مقامات، باغ پارک اور جھیلوں کی سیر کے ساتھ ساتھ اپنی خوب صورت شاعری بھی سنائی۔ عاشق رحیل صاحب کی رفاقت بھی خوب رہی۔ کینیڈا کا یہ سفر میری زندگی کے چند یادگار اسفار میں سے ہے۔ البتہ نیاگرافال کے نظارے کے متعلق یہی کہوں گا۔ سبحان اللہ! سبحان اللہ! سبحان اللہ

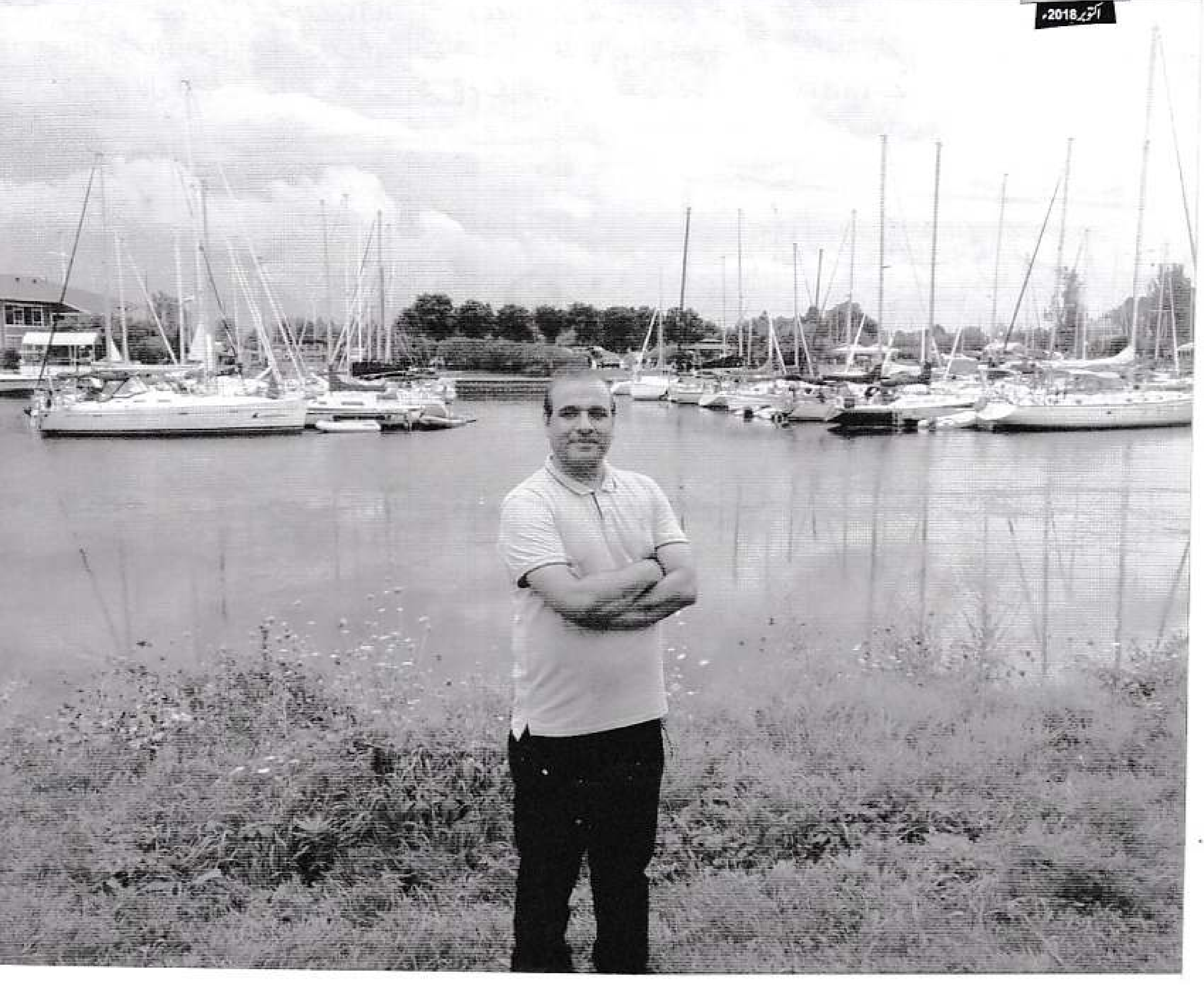

کر چلی گئی تھی۔"

اسد اس کو انتہائی غور سے دیکھ رہا تھا۔ "تم اس کا گانا سننا چاہتے ہو؟" اس کے لہجے میں شوخی تھی۔

"تم اچھی طرح جانتے ہو میں ان خرافات سے دور ہی رہتا ہوں۔"

"پھر کیا دل آ گیا ہے اس ماہ جبین پر؟"

"نہیں یار ایسی کوئی بات نہیں۔"

"پھر مسئلہ کیا ہے؟ پتہ تو چلے۔"

"بس یار کیا کہوں! وعدہ کرو میرا مذاق نہیں اُڑاؤ گے۔" وہ جھینپ کر بولا۔

"وعدہ رہا...... بھلا میں تمہارا مذاق کیوں اُڑاؤں گا۔" اسد نے اسے یقین دلایا۔

"تم نے اس کی آنکھیں دیکھی ہیں؟"

"خاص طور پر آنکھوں پر تو غور نہیں کیا۔ ویسے وہ بے حد خوبصورت تھی۔ اسد کے لہجے میں حیرت تھی لیکن تمہاری کیا پرابلم ہے؟"

"صورت شکل تو جو تھی سو تھی۔ مجھے تو وہ بھیگی بھیگی آنکھیں بھلائے نہیں بھولتیں جیسے سطح آب پر جلتے ہوئے دیے۔ جانے کیا تھا ان آنکھوں میں۔ ان کہا درد، زمانے سے شکوہ یا کوئی مجبوری۔ پتہ نہیں بیچاری کن حالات میں وہاں پہنچی ہوگی۔ کسی نے دھوکا دیا یا پھر انہی بدنام گلیوں میں پیدا ہوئی ہوگی۔ تم نے دیکھا نہیں کتنی شرافت تھی اس کے چہرے پر۔ کاش میں اس کے لیے کچھ کر سکوں۔"

اسد کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر قہقہہ لگا کر بولا "گانا تم اس کا سننا نہیں چاہتے۔ شکل وصورت شاید یاد نہیں۔ خالی آنکھوں کا اچار ڈالو گے۔"

"اُڑا لو میرا مذاق! میں تو تمہارے پاس آیا تھا کہ تم مجھے کوئی حل بتاؤ گے۔" شہباز روٹھ سا گیا۔

"میں چلتا ہوں"

"ارے بیٹھو میرے سادھو...... چلو ایسا کرتے ہیں۔ تمہاری کنول نینی کے ہاں چلتے ہیں۔ جی بھر کر ان آنکھوں کو دیکھ بھی لینا۔ جو پوچھنا چاہتے ہو پوچھ بھی لینا۔"

"نہیں بھئی...... میں وہاں نہیں جا سکتا۔ اگر میرے کسی سٹوڈنٹ یا کولیگ کو پتہ چل گیا تو میری کیا عزت رہ جائے گی اور پھر ابا جان وغیرہ کیا سوچیں گے۔"

"تایا جان تو خوش ہوں گے کہ ان کا بیٹا نارمل ہو گیا ہے اور خاندانی شوق اپنا رہا ہے۔" اسد نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

"بکواس نہیں کرو" شہباز جھینپ گیا۔ "کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونی چاہیے۔"

"تم بے فکر رہو کسی کو ہوا بھی نہیں لگے گی۔ بس تم کل سات بجے خوب بن سنور کر آ جانا۔ پھر کوچہ جاناں چلیں گے۔" اسد نے ایک آنکھ دبا کر اُسے چھیڑا۔

"تم پکے بدمعاش ہو۔"

شہباز اور اسد کو دیکھ کر زمرد بائی نہال ہو گئی "زہے نصیب...... آج تو ہمارے بھاگ جاگ گئے۔ چھوٹے سردار صاحبان تشریف لائے۔ آیئے بیٹھے......"

اسد تو بڑی بے تکلفی سے بیٹھا تھا۔ شہباز کا عالم تو یہ تھا جیسے ابھی اٹھ کر بھاگ جائے گا۔ مارے شرم کے اس کی آنکھیں ہی نہیں اٹھ رہی تھیں۔

"گانا سنیں گے یا رقص سے دل بہلائیں گے۔" زمرد نے کلے میں پان ٹھونستے ہوئے پوچھا۔

شہباز کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اسد بول اُٹھا "صرف گانا سنیں گے وہ بھی ماہ نور کا۔"

دھیرے دھیرے اسد کا جانا موقوف ہو گیا۔ پھر شہباز کا آنا جانا لگا رہا۔ گانا کم سنا جاتا دونوں کے درمیان ہلکی پھلکی گفتگو ہوتی رہتی۔ "آپ پڑھی لکھی لگتی ہیں؟"

"میں نے کنیرڈ سے بی اے کیا ہے۔"

"گانے کے علاوہ اور کیا کرتی ہیں؟"

"کتابیں پڑھتی ہوں۔ کلاسیکل گانے سنتی ہوں۔" شہباز جاتے وقت نوٹوں کی گڈی رکھ کر چلا جاتا۔ زمرد نہال ہو ہو جاتی۔ شہباز کی سو سو بلائیں لیتی۔ اس آنے جانے کا نتیجہ وہی نکلا جو نکلنا چاہیے تھا۔

ایک روز بولا "ایک بات پوچھوں برا تو نہیں مانیں گی۔"

"ہماری ٹریننگ ہی ایسی ہوتی ہے کہ ہم کسی بھی بات کا برا نہیں مانتے۔"

"یہاں کی عورتوں کی کیا مجبوری ہے کہ یہ ......میرا مطلب ہے" وہ اٹک سا گیا۔

"سب سے بڑی مجبوری بھوک، افلاس اور بیماری ہے۔ پیٹ بھوکا ہو تو نہ کوئی اخلاقیات باقی رہتی ہے نہ مذہب نہ سماج۔ جو عورتیں یہاں رہتی ہیں کوئی بھی یہاں شوق سے نہیں رہتی۔ جو یہاں پیدا ہوئیں یا کسی بھی وجہ سے ان بدنام گلیوں میں پہنچ گئیں وہ کہاں جائیں؟ پیٹ کی بھوک مٹانے کے لیے کیا کریں؟ کون ان کو عزت کی روٹی دے گا۔ معاشرہ انہیں نفرت سے دھتکارتا ہے۔ ان کوٹھوں کے علاوہ کہیں بھی ان کے لیے جائے اماں نہیں ہے۔" کافی دیر دونوں اپنے اپنے خیالات میں گم رہے۔

پھر ماہ نور بولی "آپ یہاں نہ آیا کریں۔"

"کیوں؟ آپ کو اچھا نہیں لگتا؟"

"آپ اس ماحول میں جچتے نہیں ہیں۔"

شہباز تھوڑی دیر ماہ نور کو دیکھتا رہا پھر بولا

''آپ بھی تو یہاں نہیں سجتیں۔''

''میری تو مجبوری ہے'' ماہ نور کے لہجے میں یاسیت گھلی ہوئی تھی۔

''میری بھی مجبوری ہے۔'' ماہ نور خاموش رہی۔

''پوچھو گی نہیں میری کیا مجبوری ہے؟''

''شاید جانتی ہوں۔ اسی لیے آپ کو آنے سے منع کررہی ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ یہ ملنا ملانا آپ کی آنے والی زندگی کے لیے پریشانی کا باعث بنے۔ ہم لوگ دو مختلف سیاروں کے لوگ ہیں۔ جو ایک مدار میں گھوم تو سکتے ہیں لیکن آپس میں کبھی مل نہیں سکتے۔ خدا نہ کرے اگر کبھی مل گئے تو تباہی و بربادی یقینی ہوگی۔''

شہباز گہری نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

''میں تو برباد ہوں ہی۔ اللہ نہ کرے میری اس منحوس زندگی کی پرچھائیں بھی آپ پر پڑیں۔ آپ بہت نیک اور اچھے انسان ہیں۔ لوٹ جایئے اپنی دنیا میں جہاں خوشیاں آپ کا انتظار کررہی ہیں۔ جلد ہی کسی اچھی خاندانی لڑکی سے آپ کی شادی ہوجائے گی۔ ماہ نور آپ کو بھولے سے بھی یاد نہیں آئے گی۔''

''ماہ نور میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' شہباز نے پہلی دفعہ بڑی ہمت کرکے ماہ نور کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔

''خدا کے لیے انہونی باتیں نہ کریں۔ اپنی اور میری حیثیت کے فرق کو کیوں بھول رہے ہیں آپ...... آسمان اور زمین کا ملن کبھی ہوا ہے؟''

''میں ان سب باتوں کو نہیں مانتا۔ اللہ تعالیٰ نے سب انسان برابر بنائے ہیں۔''

''کیچڑ اور مشک کبھی برابر نہیں ہوسکتے۔'' ماہ نور کی آنکھیں کھارے پانی سے بھر گئیں۔

''پلیز میری بات مان لیں۔ آپ آگ سے کھیل رہے ہیں۔ سب کچھ جل کر راکھ ہوجائے گا۔''

''آپ میرے ساتھ جلنا نہیں چاہتیں۔''

''میرا کیا ہے۔ میں تو پہلے ہی راکھ ہوں۔ مجھے آپ کی فکر ہے۔''

زمرد کے کانوں تک بات پہنچی تو وہ آگ بگولہ ہوگئی لیکن اس نے بڑے پیار سے شہباز سے بات کی۔ ''سردار صاحب آپ کو کیا مصیبت پڑی ہے موری کی اینٹ چوبارے پر لگانے کی۔ رنڈیوں کے ساتھ عزت دار لوگ شادی وادی کا جھنجھٹ نہیں پالتے۔ یہاں وڈیرے، سیاست دان، آفیسر، بڑے بڑے نام والے آتے ہیں۔ کچھ دن عیش کرتے ہیں پھر اپنی راہ لیتے ہیں۔ آپ بھی اپنے والد، بھائیوں اور خاندان کے لوگوں کے نقش قدم پر چلیں۔''

''آپ یہی چاہتے ہیں نا کہ ماہ نور آپ کی بن کر رہے تو آپ ایسا کریں اس کی نتھ کھلوائی کی رسم رکھیں۔ جب دل بھر جائے تو چھوڑ جائیں۔'' زمرد کے چہرے پر انتہا درجہ کی خباثت تھی۔

شہباز کا منہ غصے سے سرخ ہوگیا۔ ''اگر آپ عورت ذات نہ ہوتیں تو میں اس قدر گھٹیا بات کا منہ توڑ جواب دیتا۔''

''بولیں! کتنی دولت چاہیے آپ کو ماہ نور کے صدقے میں۔ میں ابھی چیک لکھے دیتا ہوں۔ یہ ابھی میرے ساتھ جائے گی۔ ایک بات دھیان سے سن لیں آج کے بعد آپ ہمیشہ کے لیے ماہ نور کی زندگی سے نکل جائیں گی۔'' شہباز غصے کے مارے کانپ رہا تھا۔

''سردار صاحب! دھیرج سے کام لیں۔ میں تو آپ کو آزما رہی تھی۔ آپ تسلی سے گھر جائیں۔ ماہ نور آج سے آپ کی امانت ہے میرے پاس...... آپ کا جب جی چاہے لے جائیں۔'' زمرد بائی نے شہباز کو بہلا پھسلا کر مطمئن کردیا۔ پھر اس نے بڑے پیار سے ماہ نور کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''میری پگلی نادان بچی! وہ جھوٹ موٹ کی شادی کا ڈھونگ رچائے گا۔ جب دل بھر جائے گا تو چچوڑی ہوئی ہڈی کی طرح پھینک دے گا۔ میں نے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے۔ میری جان! کئی یہاں سے سہاگ کے لال جوڑے کی چاہ میں گئیں اور انہیں سفید کفن بھی نصیب نہ ہوا۔ بہت ساری ذلیل ہوکر انہی کوٹھوں کو آباد کرنے چلی آئیں۔''

''نہیں اماں! وہ ایسے نہیں ہیں۔ وہ سچ مچ مجھ سے شادی کریں گے۔''

''پاگل نہ بن۔ وہ اتنے بڑے وڈیرے کا بیٹا اور تو نالی کا کیچڑ۔ بڑے سردار صاحب کو پتہ چلا تو تیری لاش بھی کہیں نہیں ملے گی۔ تو ان لوگوں کو نہیں جانتی۔ میری ایک بات اور بھی پلو سے باندھ لے طوائف...... طوائف ہی رہتی ہے کہیں بھی چلی جائے۔ کوئی بھی روپ دھار لے۔ میری جان کب تک اور کہاں تک جھوٹ بولو گی۔ کبھی نہ کبھی اصلیت ظاہر ہوکر رہتی ہے۔ دنیا والے تجھے کہاں جینے دیں گے۔ یہ امیر زادے بڑے دل پھینک ہوتے ہیں۔ وہ جانتا ہے کہ تو صرف گانا گاتی ہے۔ تجھے حاصل کرنے کے لیے شادی کا ڈھونگ رچانا چاہتا ہے۔'' شہباز کے داخلے پر پابندی لگادی گئی۔

زمرد نے ماہ نور پر ہر حربہ آزما لیا۔ پیار، ڈانٹ، سختی۔ پھول سے بدن پر تڑاخ تڑاخ بید کی چھمک سے اس کی کھال ادھیڑ دی گئی۔ پر پھر بھی اس کی زبان پر ایک ہی نام تھا اور پھر زمرد بائی کا آخری حربہ۔ اس نے نہایت غصے سے آواز دی۔

''جگنو! جاؤ اور چوہدری حاکم دین سے کہو میں ماہ نور کی نتھ کھلوائی کے لیے تیار ہوں۔ میں نے تو اس کی خواہش پر چاہا تھا کہ یہ حرام زادی گانا ہی گاتی

رہے۔ پر اس کشتی کو عزت راس نہیں آئی۔"

ماہ نور نے سنا تو وہ ماں کے پاؤں پڑ گئی۔ وہ زار وقطار روتی جاتی تھی۔ "اماں! مجھ پر یہ ظلم نہ کرو۔ بے شک مجھے جان سے ماردو۔ تجھے پنجتن پاک کا واسطہ میری عزت داغ دار نہ کرو۔ مجھے گدھوں کے حوالے نہ کرو۔ مجھے میرے شہباز کے ساتھ جانے دو۔ اگر مجھے یہی بنانا تھا تو مجھے پڑھایا کیوں تھا۔ اماں میں تیری بیٹی ہوں۔ تجھے خدا رسول کا واسطہ میرا سر ننگا نہ کرو۔" روتے روتے ماہ نور کی ہچکی بندھ گئی۔

نہ جانے زمرد کو یک دم کیا ہوا۔ وہ کانپ گئی۔ اس نے تڑپ کر اپنے پیروں پر گری ہوئی آہ وزاری کرتی ماہ نور کو اُٹھایا اور اپنے کلیجے سے لگا لیا اور خود بھی بے تحاشا رو پڑی۔

شہباز اپنے کزن اسد، گواہوں اور مولوی صاحب کے ساتھ فوراً ہی پہنچ گیا۔ نکاح کے بعد زمرد نے ماہ نور کو ایک سفید بے داغ چادر میں سر سے پاؤں تک ڈھانپ کر شہباز کے حوالے کر دیا۔

"میں نے اسے اپنی کوکھ سے تو نہیں جنا پر اس کو میں نے سگی اولاد کی طرح پالا ہے۔ یہ تین سال کی تھی جب کوئی میرے پاس بیچ گیا تھا۔ جانے کس گلشن کا پھول تھی۔ یہ کیچڑ میں پلی ضرور ہے لیکن میں آپ کو حلفیہ کہتی ہوں کہ یہ کنول کی طرح معصوم اور پاک ہے۔"

زمرد نے ماہ نور کو بھینچ بھینچ کر پیار کیا اور آنسوؤں کی برسات میں رُخصت کیا۔ جس وقت شہباز ماہ نور کو لے کر حویلی پہنچا تو رات کے دس بج چکے تھے۔ گول کمرے میں شہباز کے والد اور والدہ کے علاوہ سارے افراد خانہ جمع تھے۔ سردار صاحب سخت غصے میں تھے۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ بندوق لے کر جائیں اور زمرد اور اس کی بیٹی کو گولیوں سے بھون کر رکھ دیں۔ سب نے بڑی مشکل سے انہیں اس انتہائی اقدام سے روکا تھا۔ ماہ نور سر سے پاؤں تک سفید چادر میں لپٹی سہمی ہوئی بارش میں بھیگی کبوتری کی طرح کانپ رہی تھی۔ سردار صاحب کی کانوں میں سیسہ انڈیلتی آواز نے جیسے اسے پاتال کی گہرائیوں میں دفن کر دیا۔

"لے جاؤ اس گندی نالے کے کیڑے کو۔ میری نظروں سے دور کرو اس دو ٹکے کی ناچنے والی کو۔"

"ابا جی! یہ میری بیوی ہے۔ اس گھر کی عزت ہے۔"

"ننگ خاندان! تمہیں جرات کیسے ہوئی اس غلاظت کے ڈھیر کو لے کر میری حویلی کی دہلیز پار کرنے کی۔ ابھی اور اسی وقت نکل جاؤ یہاں سے۔ پھر کبھی اپنی شکل نہ دکھانا۔ آج سے تم ہمارے لیے مر چکے ہو۔"

وہ ماں کو ملنے کے لیے آگے بڑھا۔ وہ بھی روتے ہوئے اسے ملنے لگیں تو سردار صاحب کی دھاڑ سے دہل کر وہیں رک گئیں۔ "اسے ملنا ہے تو پھر میری طرف سے تمہیں طلاق ہے۔ اسی کے ساتھ چلی جاؤ۔ دوسرے لوگ بھی کان کھول کر سن لیں اگر اس ناخلف سے کسی نے کوئی واسطہ رکھنے کی کوشش کی تو اسے بھی عاق کر دوں گا۔"

شہباز نے وہ گھر تو چھوڑا سو چھوڑا۔ اس نے وہ ملک ہی چھوڑ دیا جہاں اس کی ماہ نور کو ذلیل کیا گیا۔ ایک دوسرے کو پا کر وہ اتنے خوش اور مگن تھے کہ انہیں کسی اور کو یاد کرنے یا پچھلی باتیں دہرانے کی فرصت ہی نہیں تھی۔ ماہ نور کو تو گویا سارا جہان مل گیا تھا۔ پیار کرنے والا شوہر، دولت، عزت، کسی چیز کی کمی نہیں تھی ان کی زندگی میں۔ ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر جیتے تھے۔ پانچ سال ایسے گزرے جیسے پانچ پل گزرے ہوں۔

ادھر کچھ دنوں سے ماہ نور کو چپ سی لگ گئی تھی (وہ سوچ رہی تھی کہ ان دونوں کے علاوہ کوئی تیسرا وجود ان کے درمیان ہونا چاہیے)۔ شہباز نے اس کی خاموشی کا سبب پوچھا تو وہ رو پڑی۔

"میں نے آپ کو والدین سے جدا کیا شاید اسی لیے اللہ تعالیٰ نے مجھے ابھی تک اولاد کی نعمت سے محروم رکھا ہے۔ کاش میں آپ کی زندگی میں نہ آئی ہوتی۔"

"بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔ تم میری زندگی میں کیسے نہ آتیں۔ اوپر والے نے تمہیں تو زمین پر اُتارا ہی میرے لیے تھا۔ رہی بات بچہ نہ ہونے کی تو بھئی جب اللہ تعالیٰ کو منظور ہوگا تو ہو جائے گا۔" شہباز نے اس کے آنسو پونچھے اور تسلی دی۔

ماہ نور وقتی طور پر تو بہل گئی پر بچہ نہ ہونے کی پھانس جیسے اس کے دل میں گڑ گئی تھی۔ راستہ چلتے چھوٹے بچوں کو دیکھ کر دیوانی ہو جاتی۔ پکڑ پکڑ کر انہیں پیار کرتی، چومتی۔ شہباز اسے منع کرتا "کسی دن اگر بچے کی ماں نے پولیس کو شکایت کر دی تو حوالات کی ہوا کھاؤ گی۔"

"میں کیا کروں؟ بس مجھے ایک بچہ چاہیے۔" پاگلوں کی طرح رونے بیٹھ جاتی۔

"یار میں تمہیں کسی کے ساتھ شیئر نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ کو یہ معلوم ہے اسی لیے اس نے ہمیں بچہ نہیں دیا۔ ویسے اس کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتے۔ اتنے ڈاکٹرز کو دکھا چکے ہیں۔ وہ بھی یہی کہتے ہیں اگر اولاد نصیب میں ہوئی تو ضرور ہوگی۔ اللہ کا شکر ہے ہم دونوں میڈیکلی فٹ ہیں۔"

دھیرے دھیرے ماہ نور نے جیسے صبر کر لیا تھا۔

اپنے دل کو سمجھا لیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اتنی ڈھیر ساری خوشیاں دے کر ایک نعمت سے محروم رکھا ہے۔ اس میں کوئی بہتری ہوگی۔ پر چپکے چپکے دعائیں مانگنا نہیں چھوڑا تھا۔ پندرہ سولہ سال یورپ گھومنے کے بعد شہباز کو سیٹل ہونے کے لیے دبئی بے حد پسند آیا تھا۔ ماہ نور بھی بہت خوش تھی۔ دبئی کی زندگی یورپ سے بالکل الگ تھی۔ دبئی کے مقابلے میں یورپ کے عام لوگ انتہائی سادگی پسند تھے۔ عورتوں کو دیکھ کر ماہ نور کو بہت حیرت ہوتی۔ نہ اعلیٰ لباس نہ میک اپ نہ جیولری۔ صبح سویرے اپنی اپنی نوکریوں پر نکل جاتے شام کو واپس آ کر کھانا کھاتے اور سو جاتے۔ ایسے لگتا جیسے سارا شہر بھی سو گیا ہے۔ سرِشام سب دکانیں بند ہو جاتیں۔ سوائے میڈیکل سٹورز وغیرہ کے ویک اینڈ پر شہر میں رونق ہنگامہ ہوتا۔

دبئی میں رات بھر شاپنگ مالز کھلے رہتے ہیں۔ دنیا بھر سے ثروت مند لوگ گھومنے پھرنے اور شاپنگ کرنے آتے ہیں۔ برج العرب مشہور شاپنگ مال، مختلف ملکوں رنگوں اور نسلوں کے لوگوں سے بھرا رہتا ہے۔ یہاں گھومتے پھرتے ایسے لگتا جیسے دنیا میں نہ کہیں غربت ہے نہ دکھ نہ کوئی پریشانی۔

ویک اینڈ پر شہباز اسے خوب گھماتا پھراتا۔ تھوڑے دنوں میں ہی ان لوگوں نے کافی سارے مشہور مقامات دیکھ لیے تھے۔ ابن بطوطہ مال واٹر، پارک مال آف ایمیریٹ وغیرہ۔ ''برج خلیفہ'' دنیا کی سب سے اونچی بلڈنگ کو ماہ نور حیرت میں گم دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی ''انسان کہاں ٹھہرے گا۔''

ماہ نور کو Palm Jumera دبئی کا سب سے خوبصورت اور مہنگا ترین علاقہ دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ یہاں بڑے بڑے ایکٹروں، کھلاڑیوں، سرمایہ داروں اور سیاست دانوں کے اپارٹمنٹس ہیں۔ جن کی قیمت کروڑوں میں ہے۔

''اتنی خاموش کیوں ہوگئی ہو؟ سوچ رہی ہو کہ میں کب تمہیں یہاں گھر خرید کر دوں گا۔'' شہباز نے ماہ نور کو چھیڑا۔

''نہیں یار ایسی بات نہیں ہے۔ میں تو اللہ جی سے شکوہ کناں ہوں کہ اتنا تضاد کیوں ہے اس کی مخلوق میں۔ ایک طرف نان جویں کو ترستے بھوک سے مرتے لوگ اور دوسری طرف یہ لوگ۔ کیسی راس رچائی ہے اس نے۔''

''پگلی یہ میرے تیرے سوچنے کی باتیں نہیں ہیں۔ وہ سب کا خالق اور رازق ہے۔ وہ بہتر جانتا ہے۔ اُلٹی سیدھی باتیں سوچ کر پریشان نہ ہوا کرو بس خوش رہا کرو۔ میرے لیے اور اپنے لیے۔'' شہباز نے پیار سے اس کے سر کو تھپکا۔

ایک شام وہ دبئی فیسٹیول میں گھوم رہے تھے کہ اچانک ایک لڑکی خاتون شہباز سے آ کر لپٹ گئی۔

''بھیا! مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا۔ یہ آپ ہیں نا۔'' شہباز نے بھی اسے بازوؤں میں بھر لیا۔ دونوں کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ رونے دھونے کا سلسلہ ختم ہوا تو شہباز کو ماہ نور کا خیال آیا۔ شہباز کے کچھ بتانے سے پہلے ہی لڑکی نے ماہ نور کو بھینچ کر گلے لگا لیا۔ ''میری بھابھی''

''کہاں کھو گئے تھے آپ؟ کوئی ایسے کرتا ہے اپنے پیاروں کے ساتھ؟''

''چلو آؤ گھر چل کر باتیں کرتے ہیں۔'' بچھڑے ہوئے بہن بھائی ملے تو کتاب ماضی کے ورق اُلٹنے لگے۔

''سچ بتائیں آپ کو کبھی ہماری یاد نہیں آئی۔ آپ ایسے کٹھور تو نہیں تھے۔''

''ماں باپ، بہن بھائی بھلائے نہیں جا سکتے۔ جن حالات میں گھر چھوڑا تھا وہ تو تم جانتی ہی ہوگی۔ ابا جان کے نادر شاہی حکم کے آگے میری کیا مجال تھی۔ میں اگر کبھی پلٹ بھی آتا تو انہوں نے کون سا مجھے معاف کر دینا تھا۔ میری وجہ سے سارے گھر والے زیرِ عتاب آ جاتے اس لیے میں نے لوٹنے کا خیال ہی چھوڑ دیا۔''

پورے خاندان کا حال پوچھا گیا۔ ماں باپ کے انتقال کا سن کر شہباز کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔

''جس دن آپ نے گھر چھوڑا تھا اسی دن سے اماں کو چپ سی لگ گئی تھی۔ نہ ہنستی نہ زیادہ باتیں کرتیں۔ زیادہ وقت عبادت میں گزارتیں۔ پہروں چپ بیٹھی خلاؤں میں گھورتی رہتی تھیں۔''

''کیا مجھے کبھی یاد کرتی تھیں؟''

''آپ کا نام تو کبھی نہیں لیا تھا لیکن صاف ظاہر تھا کہ آپ کی جدائی میں وہ گیلی لکڑی کی طرح سلگ رہی تھیں۔ بظاہر انہیں کوئی بیماری لاحق نہیں تھی۔ ڈاکٹر بھی ان کا علاج کرنے سے قاصر تھے۔ اس لیے کہ جدائی کے روگ کا کوئی علاج نہیں۔''

''بس کرو۔ مجھ بدنصیب کی وجہ سے ماں اس حال کو پہنچی۔'' شہباز نے رومال میں منہ چھپا کر آنسوؤں کے دریا بہا دیے۔

''آپ کے جانے کے ٹھیک پانچ برس بعد اُن کی روح کو سکون مل گیا۔ وہ اپنے ابدی ٹھکانے چلی گئیں۔ ماں کے جانے کے بعد ابا جی بالکل بدل گئے تھے۔ زمینوں کا سارا انتظام بڑے بھیا کے سپرد کر کے سب معاملات سے جیسے لاتعلق سے ہو گئے تھے۔ نہ آواز میں وہ گھن گرج رہی نہ دوستوں کی دعوتیں، نہ شکار پارٹیاں۔ زیادہ وقت اپنے کمرے میں ہی گزارتے تھے۔ ان کا انتقال ہوئے بھی پانچ چھ برس

گزر چکے ہیں۔"

"ماہ نور بیچاری مجرم سی بن گئی۔ آپ باتیں کریں میں آپ کے لیے جوس لے کر آتی ہوں۔" اس نے وہاں سے ٹل جانا ہی مناسب سمجھا۔

رونے دھونے سے دل کا غبار جیسے ڈھل گیا تھا۔ تھوڑی دیر دونوں کے درمیان خاموشی تیرتی رہی۔ پھر شہباز نے خاموشی کو توڑا "بڑے بھیا، چھوٹے بھیا اور ان کی آل اولاد کیسی ہے؟"

"سب لوگ ٹھیک ہیں۔ سب کے بچے ماشاء اللہ بڑے ہو گئے۔ جوان بوڑھے ہو گئے ہیں۔" بہن نے فرداً فرداً سب کے بارے میں بتایا۔

"اپنے شوہر نامدار اور بچوں کے بارے میں بتاؤ۔"

"میرے دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ امتیاز ایک آئل کمپنی میں کیمیکل انجینئر ہیں۔ آپ کے کتنے بچے ہیں؟"

ماہ نور نے ابھی کمرے کی دہلیز پار نہیں کی تھی کہ اپنا ذکر سن کر رک گئی۔

"بیچاری بھابھی تو بچے کے لیے بہت تڑپتی ہو گی۔"

"ہاں پہلے کافی پریشان رہتی تھی۔ شاید اب اس نے صبر کر لیا ہے۔"

"باہر تو بڑے ماہر ڈاکٹر ہیں۔ آپ نے وہاں نہیں دکھایا؟"

"بہت سے ڈاکٹروں کو دکھا چکے ہیں۔ سب نے یہی کہا کہ ہم دونوں بالکل ٹھیک ہیں۔ جب اللہ کو منظور ہوگا تو بچہ ہو جائے گا۔"

"آپ نے ٹیسٹ ٹیوب بے بی کے بارے میں نہیں سوچا کبھی۔"

"بس کبھی خیال ہی نہیں آیا۔"

"یہاں بڑی مشہور گائناکولوجسٹ ہے۔ وہ ٹیسٹ ٹیوب بے بی کی ماہر ہے۔ سنا ہے نوے فیصد جوڑوں کی مراد بھر آتی ہے۔ میں آپ دونوں کو اس کے پاس لے کر جاؤں گی۔"

"کمال کرتی ہو۔ اب اس بڑھاپے میں بچے پیدا کرتے کیا اچھے لگیں گے۔"

"آپ ابھی سے بوڑھے کیسے ہو گئے۔ بھابھی زیادہ سے زیادہ اڑتیس کی ہوں گی اور آپ پینتالیس کے ہوں گے۔"

"چھوڑو بھی اب نئے سرے سے کیا دل کو جھوٹی اُمیدوں سے بہلانا۔ اتنے سال ہو گئے اگر خدا نے اولاد دینی ہوتی تو ضرور دے دیتا۔ اس میں بھی ہمارے لیے کوئی بہتری ہوگی۔ ویسے بھی ہم دونوں نے اپنے دل کو سمجھا لیا ہے اور اپنی تقدیر پر شاکر ہیں۔"

"نہیں بھائی آپ چاہے لاکھ انکار کریں۔ میں جانتی ہوں بھابھی کبھی انکار نہیں کریں گی۔ آپ کو ان کی خاطر مان جانا چاہیے۔"

"ضد مت کرو۔ ڈاکٹر کے پاس جانے کا کوئی فائدہ نہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"دراصل میں...... میرا مطلب ہے...... میں اب تمہیں کیسے بتاؤں۔"

"تو کیا آپ......" بہن کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔

"تم غلط سمجھ رہی ہو۔ میں نے شادی کے بعد اپنا آپریشن کروا دیا تھا۔" وہ جھجکتے ہوئے بولا۔

بہن ایک دو لمحے تو سکتے کی کیفیت میں رہی۔

"آپ نے ایسا کیوں کیا؟" وہ خاموش رہا۔

"بتائیں نا یہ ظالمانہ اقدام آپ نے کیوں کیا؟ ایک عورت کو ماں بننے کے حق سے کیوں محروم کیا؟" وہ چیخ پڑی۔

"میں بھی تو باپ بننے کے حق سے محروم ہوا۔ کیا مجھے اس کا دکھ نہیں ہوا ہوگا لیکن زندگی میں کچھ فیصلے کرنے پڑتے ہیں خواہ کتنے ہی مشکل کیوں نہ ہوں۔ زمانہ اتنا بے رحم ہے کہ سات پردوں میں چھپی بات کا بھی کھوج لگا لیتا ہے۔ حقیقت کبھی نہ کبھی سامنے آ کر رہتی ہے۔ لوگ بڑے ظالم ہیں دوسروں کی کمزوریوں کی ٹوہ میں رہنا اور پھر انہیں اچھالنا ان کا دل پسند مشغلہ ہے۔ کل کو کوئی ہمارے بچوں کو طوائف زادے ہونے کا طعنہ نہ دے۔ خاص طور پر اگر کوئی بیٹی ہوئی تو وہ ماں کے ماضی کی سزا کیوں بھگتے۔ یہی سب سوچ کر یہ مشکل فیصلہ میں نے کیا تھا۔" شہباز کی آواز دکھ سے بوجھل تھی۔

شہباز کا یہ جملہ گویا بم کا دھماکہ تھا جس نے ماہ نور کی بسی بسائی نگری میں آگ لگا دی تھی۔ پل بھر میں محبت کے آسمان کا روشن ستارا زمین پر گر پڑا اور ریزہ ریزہ ہو گیا۔ اس کی ساری کائنات سارا وجود ٹکڑے ٹکڑے ہو کر فضا میں بکھر رہا تھا۔ دور کہیں سے زمرد بائی کی آواز آ رہی تھی۔

"میری بات غور سے سنو۔ طوائف...... طوائف ہی رہتی ہے۔ وہ کہیں بھی چلی جائے کوئی بھی روپ وٹا لے۔ کنول نینی نے اپنے لرزتے کانپتے وجود کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی پر ایک آواز مسلسل اس کے دل و دماغ پر ہتھوڑے برسا رہی تھی۔ طوائف......طوائف۔

ایک چھناکے سے ٹرے اور گلاس ماہ نور سمیت پکے فرش پر گرے۔ بند ہوتی آنکھوں سے اس نے اپنے اوپر جھکے شہباز کو دیکھا۔ پھر دھیرے دھیرے اس کا وجود پاتال کی گہرائیوں میں اُتر گیا۔

ننھا معمار

ریڈیارڈ کپلنگ/مترجم: نجیب عمر

پولو گیند پرانی ہو چکی تھی۔ زخمی، داغ دار اور اُدھڑی ہوئی۔ یہ طاق پر پولو کی چھڑیوں کے درمیان رکھی ہوئی تھی جسے امام دین ''خدمت گار'' میرے لیے چکار ہا تھا۔

کیا خلدِ آشیانی کو اس گیند کی ضرورت ہے؟ امام دین نے نہایت تعظیم سے سوال کیا۔

خِلد آشیانی نے اس کے لیے کوئی اسٹور تو بنایا نہیں لیکن ایک خدمت گار کے لیے یہ کس کام کی؟

اگر آپ شفقت فرمائیں۔ میرا ایک چھوٹا بیٹا ہے۔ اس نے یہ گیند دیکھا ہوا ہے اور اس سے کھیلنا چاہتا ہے۔ جبکہ مجھے اس کی قطعی کوئی حاجت نہیں۔

کوئی ایک لمحے کے لیے بھی بھاری بھرکم امام دین پر یہ الزام نہیں لگائے گا کہ وہ پولو کی گیند سے کھیلنا چاہتا ہے۔ وہ چیزیں تھیلے میں بھر کر برآمدے میں نکل آیا۔ اس کے پیچھے بچگانہ آوازوں کا ایک طوفان اور چھوٹے چھوٹے قدموں کی تھپ تھپ اور گیند کی زمین پر ٹپا کھانے کی مسلسل آواز۔ چھوٹا بچہ دروازے سے باہر انتظار میں تاکہ اپنے خزانے پر جلدی قابو پا لے لیکن وہ گھر کے اندر رکھے گیند کو کیوں کر دیکھ پایا۔

دوسرے روز معمول سے آدھا گھنٹہ قبل دفتر سے گھر لوٹتے ہوئے مجھے محسوس ہوا کہ ڈائننگ روم میں ایک چھوٹی مخلوق موجود ہے۔ ایک چھوٹا گوگلو بچہ، بے ترتیب قمیض پہنے ہوئے جس کا دامن بڑی مشکل سے اس کے بڑے پیٹ کو آدھا ڈھانپ سکتا تھا۔ انگوٹھا منہ میں لیے وہ کمرے میں ادھر اُدھر پھرتا رہا جیسے اسے کسی چیز کی تلاش ہو۔ بے شک وہ امام دین کا چھوٹا بیٹا ہی تھا۔

اگرچہ میرے کمرے میں اس کا کوئی کام نہیں لیکن اپنی تلاش میں ایسا مگن تھا کہ دروازے پر اس نے میری چاپ تک نہیں سنی۔ میں نے کمرے میں قدم رکھا وہ خوف سے تھرّا گیا۔ وہ قریب قریب ہوش کھونے کو تھا۔ زور سے سانس لیتے وہ فرش پر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں اور منہ بھی۔ میں جانتا تھا اس میں سے کیا نکلنے والا ہے۔ وہ بھاگا۔ ایک خشک اور طویل پکار جو سرونٹ کوارٹر تک اس سرعت سے پہنچی۔ شاید میرے احکامات کبھی اتنی تیزی سے پہنچے ہوں گے۔ دس سیکنڈ کے اندر امام دین ڈائننگ روم میں تھا۔ گھٹی گھٹی رونے کی آواز بلند ہونے لگی۔ میں امام دین تک پہنچا جو چھوٹے مجرم کو تنبیہ کر رہا تھا۔ جو اپنے قمیض کے دامن کو رومال کے طور پر استعمال کیے جا رہا تھا۔

یہ لڑکا۔ امام دین عدالتی حکم جاری کرتے بولا۔ یہ بدمعاش ہے۔ ایک بڑا بدمعاش۔ یہ اپنی حرکتوں سے، مجھے ذرا شک نہیں یہ جیل کی ہوا کھائے گا۔

شرمسار مجرم نے اپنا ماتم برقرار رکھا اور امام دین میرے سامنے اپنی معافی کو طول دیے جا رہا تھا۔

اس بچے کو بتاؤ، صاحب اس سے ناراض نہیں اور اسے لے جاؤ۔ امام دین نے میرا عفو و درگزر اس بچے تک پہنچایا۔ جس نے اتنی دیر میں ساری قمیض کو رسی بنا کر اپنی گردن کے گرد لپیٹ لیا تھا۔ اب اس کے حلق میں جکڑی ہوئی چیخ رونے میں بدل چکی تھی۔

امام دین نے کہا اس کا نام (جیسے اس کا نام بھی جرم کا حصہ ہو) محمد دین ہے اور یہ ایک بدمعاش ہے۔ موجودہ خطرے سے آزاد ہوتے ہی محمد دین اپنے والد کے بازوؤں میں جھول گیا اور گہری آواز میں بولا۔ یہ صحیح ہے کہ میرا نام محمد دین ہے تاحب لیکن بدمعاش نہیں ایک آدمی ہوں۔

اس دن سے محمد دین سے میرے تعلقات بحال ہو گئے۔ اس کے بعد وہ کبھی میرے ڈائننگ روم میں نہیں آیا لیکن اب وہ باغ کے اس حصے میں نظر آتا جو مکان کا بیرونی حصہ تھا۔ اب ہم ایک دوسرے سے زیادہ بہتر طریقے سے ملتے اور سلام کا تبادلہ کرتے۔ اگرچہ ہماری گفتگو ''تلام تاحب'' اس کی جانب سے اور میری جانب سے ''سلام محمد دین'' تک محدود رہتی۔

روزانہ دفتر سے واپسی پر چھوٹی سی سفید قمیض اور موٹا لیکن چھوٹا جثہ، بیلوں کے اوپر چڑھنے کے لیے بندھے دھاگوں کے پیچھے سے نمودار ہوتا۔ جہاں وہ خود کو چھپائے رکھتا۔ میں وہاں اپنے گھوڑے کو لگام دیتا تاکہ میرا سلام خالی نہ چلا جائے یا نظرانداز نہ ہو جائے۔

محمد دین ہمیشہ اکیلا ہوتا۔ اس کے ساتھ کوئی بھی نہیں ہوتا۔ وہ باغ کے کپاؤنڈ میں چلتا پھرتا۔ رینڈی کی جھاڑیوں میں پراسرار طریقے سے غائب ہوتا اور پھر نکل آتا۔

ایک روز باغ کے ایک کونے میں اس کی دبتی

ہنرمندی پر میرا پاؤں پڑ گیا۔اس نے پولوگیند کو نصف دفن کیا ہوا تھا۔اس کے اطراف اس نے چھ گل مریم، نارنجی رنگ کے مرجھائے ہوئے دائرے میں سجے ہوئے تھے۔اس دائرے کے باہر سرخ اینٹوں کے ٹکڑوں اور چینی کے برتنوں کے ٹکڑوں کو یکے بعد دیگرے ترتیب سے ایک مربع بنا دیا تھا اور ان سب کو ریت کے بند سے گھیر رکھا تھا۔ پانی دینے والا اس چھوٹے معصوم معمار کی حمایت میں اس کی تعمیرات کو بچائے رکھتا اور اس کی دلیل یہ ہوتی کہ اس سے باغ کی ترتیب میں کوئی خرابی پیدا نہ ہوتی۔

خدا جانتا ہے کہ نہ اب اور نہ بعد میں کبھی ارادتاً اس کے تعمیرات کو چھیڑتا لیکن اس شام چہل قدمی کرتے میرا پورا پاؤں وہاں پڑ گیا۔اس سے پہلے کہ میں سمجھ پاتا کہ میں نے ایک معصوم کی کاوش کو اُجاڑ دیا ہے۔گل مریم کے نارنجی شگوفے ریت کے چھوٹے سے بند کے اندر صابن دانی کے سفید ٹکڑے میں نے انہیں نا قابل اصلاح حد تک اُجاڑ دیا تھا۔

دوسرے روز میں محمد دین کے سامنے کھڑا تھا جو اپنے تئیں دبی آواز سے رو رہا تھا کہ میں نے اس کے حسن ترتیب کو پامال کیا تھا۔کسی نے اسے بتایا تھا کہ صاحب تمہاری اس حرکت پر سخت ناراض ہیں۔کیوں کہ تم باغ کو خراب کر رہے ہو۔لہٰذا انہوں نے اس کوڑے کو روند ڈالا اور گالیاں بھی نکالیں۔

محمد دین نے ایک گھنٹہ صرف کر کے ریت کے بند کو مٹایا۔اینٹوں اور برتن کے ٹکڑوں کو وہاں سے ہٹا کر آنسوؤں سے تر اور معذرت خواہانہ چہرے کے ساتھ میرے دفتر سے لوٹنے پر کہا'' تلام تاب''

ایک ہنگامی تفتیش کے بعد امام دین نے محمد دین کو بتایا کہ اسے اجازت دے دی گئی ہے کہ وہ دوبارہ جیسا چاہے بنا لے۔اس بچے کو ہمت ہوئی۔وہ اپنے منصوبے کے خدوخال تیار کرنے میں لگ گیا۔اب اس نے گل مریم اور پولوگیند کی تخلیق کو ایک احاطے میں لانا تھا۔

چند مہینوں سے وہ گوگلو گداز بچہ نئی نئی راہیں نکالنے والا، رینڈی کی جھاڑیوں اور مٹی کے درمیان اپنے معصوم مدار پر گھومتا رہتا۔ ہر وقت شاندار قسم کے مٹی کے گھروندوں کو استعمال شدہ پھولوں، چکنے دریائی کنکر پتھروں، شیشوں کے ٹکڑوں اور بچے ہوئے پروں سے سجاتا رہتا۔ میں خوش ہوتا کہ میرے پالتو پرندوں سے اسے یہ حاصل ہوتا۔وہ ہمیشہ اکیلا رہتا اور اپنے تئیں دبی آواز میں کچھ گنگناتا رہتا۔

ایک خوبصورت سیپ مختلف رنگوں کے دائروں سے مزین میں نے اس کے پرانے تعمیرات کے گرد پڑا ہوا دیکھا اور میں نے یہ بھی دیکھا کہ اب محمد دین کچھ خاص چیز اپنی تمام تر مہارت استعمال کرتے تیار کرنے جا رہا ہے۔تقریباً ایک گھنٹہ وہ خوب غور و خوض کرتا رہا۔اس کی دبی دبی گنگناہٹ اب جوشیلے نغمے میں بدل چکی تھی۔اس نے پھر مٹی پر نشان ڈالنا شروع کیا۔ یہ کوئی دو گز لمبا اور گز بھر چوڑا منصوبہ تھا۔نہ جانے وہ کیا بنانا چاہتا تھا۔

دوسرے روز گھوڑا گاڑی والے راستے کے چھجے کے آگے محمد دین نہیں تھا اور نہ میرے استقبال کو ''تلام تاحب'' تھا۔ میں اس کے استقبال اور سلام کا عادی ہو چکا تھا۔لہٰذا اس معصوم آواز کے غیاب نے مجھے پریشان کر دیا۔

امام دین نے دوسرے روز بتایا کہ وہ ہلکے بخار میں مبتلا ہے اور اسے کونین کی ضرورت ہے۔اسے دوا دے دی گئی تھی اور ایک انگریز ڈاکٹر بھی۔

ان غیر مہذب بچوں میں بیماری کے خلاف قوت مدافعت نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر نے امام دین کے کوارٹر سے نکلتے ہوئے کہا۔

ایک ہفتے کے دوران میں مَیں نے اس کے خیال کو ٹالنے کی بڑی کوشش کی لیکن میں اسے بھلا نہیں پایا اور ایک روز مسلمانوں کے قبرستان کو جانے والے راستے پر امام دین کو ایک اور ساتھی کے ساتھ دیکھا۔وہ اپنے بازوؤں میں سفید کپڑوں میں لپٹا محمد دین کے باقیات کو اُٹھائے ہوئے جا رہا تھا۔

سہیل یار/ لاہور

میں ڈوبتا تھا تو تنکا سہارا لگتا تھا
بھنور بھی دور سے مجھ کو کنارہ لگتا تھا
یہ زیست اب بھی مری دسترس سے باہر ہے
میں اس بساط میں پہلے بھی ہارا لگتا تھا
میں آج تک وہ کھلونا نہیں خرید سکا
جو میرے بیٹے کو بچپن میں پیارا لگتا تھا
یہ اور بات کہ اپنا نہ سمجھا تم نے کبھی
زمانے بھر کو تو میں بس تمہارا لگتا تھا
تمہاری شکل پہ پریاں بھی رشک کرتی تھیں
بدن بھی خلدِ بریں سے اُتارا لگتا تھا
تمہاری سمت اگر دیکھتا بھی تھا کوئی
تو دل شکستہ، جگر پارہ پارہ لگتا تھا
مرا قصور فقط اتنا تھا کہ شہر میں یار
ہر ایک شخص مجھے جاں سے پیارا لگتا تھا

نوبیل انعام یافتگان کا ترک وطن

عامر بن علی/ جاپان

وہ شخص جو نیکر پہنے ہوئے اپنی گاڑی دھو رہا ہے، دو سال پہلے تویاما یونیورسٹی کے اس پروفیسر کو بیالوجی کے شعبے میں عالمی نوبیل انعام سے نوازا گیا ہے۔ میں نے اس دن سے پہلے کبھی کسی نوبیل انعام یافتہ شخصیت کو روبرو نہیں دیکھا تھا، اسی لیے اپنے دوست کی بات سن کر ٹھٹک گیا۔ اس آدمی کو اپنی 660 سی سی سوزوکی کار کو، ایک ہاتھ میں بہتے پانی کا ربڑ والا پائپ اور دوسرے ہاتھ میں شیمپو میں ڈوبا ہوا اسفنج پکڑے، دھوتے ہوئے میں کافی دیر تک دیکھتا رہا۔ محلے کے دوسرے عمومی گھروں کی طرح بیالوجی کے اس پروفیسر کا گھر بھی پانچ مرلہ رقبے پر مشتمل ہوگا، جس کے گیراج کے سامنے وہ اپنی سواری کو اگلے ہفتے کے لیے تیار کر رہا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے اتوار کے دن باقی اہالیان شہر گھر کے کاموں اور صفائی ستھرائی میں جت جاتے ہیں، پروفیسر بھی اپنے کام نمٹا رہا تھا۔

کھچڑی بالوں والے ادھیڑ عمر کے اس سائنسدان اور اس کی زندگی میں مجھے تو کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آئی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ وہ مجھے اپنے محلے میں زیادہ مقبول بھی نہیں لگا، کیونکہ اہل محلہ آتے جاتے ہوئے اس سے سلام، دعا بھی کوئی زیادہ نہیں لے رہے تھے۔ ندی کنارے واقع مذکورہ سائنسدان کے اس محلے میرا اتوار کے دن اکثر گزر ہوتا ہے۔ اس ندی کے شفاف پانی میں رنگ برنگی مچھلیاں صاف دکھائی دیتی ہیں، دونوں کناروں پر درختوں کی قطاریں ہیں جن پر کبوتر، کوے چڑیاں اپنی اپنی بولی بولتے ہیں۔ میری عادت ہے کہ چھٹی کے دن ان مچھلیوں اور پرندوں کو ڈبل روٹی کے ٹکڑے ڈالتا ہوں، خوراک کے حصول کے لیے جب یہ سب لپکتے ہیں تو بہت بھلے لگتے ہیں۔ کبوتر خاص طور پر جلدی فرینک ہو جاتے ہیں اور ہاتھوں سے ڈبل روٹی چھیننے کی بھی کوشش کرتے ہیں۔ اب اس ندی کنارے محلے میں جب بھی جاتا ہوں تو متذکرہ پروفیسر سائنسدان کے گھر کی طرف اچٹتی ہوئی اک نگاہ غیر ارادی طور پر ڈال لیتا ہوں۔ میرا اب تک کا مشاہدہ یہی ہے کہ وہ عام شہریوں کی طرح ایک عامی زندگی گزار رہا ہے۔ گوکہ اس نے بیالوجی کے شعبے میں غیر معمولی کام سرانجام دیا ہے، مگر اس بات کا احساس تو اس کی یونیورسٹی اور لیبارٹری سے متعلق احباب کو ہی ہوگا، اپنی گلی، محلے میں تو وہ ایک معمول کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ پاکستان سے تعلق رکھنے والے تین افراد کو اب تک عالمی نوبیل انعام دیا گیا ہے۔ پہلا نوبیل انعام میرے آبائی ضلع کی تحصیل کبیر والہ کے ایک گاؤں رائے پور میں پیدا ہونے والے ہرگوبند کھرانہ اور دوسرا ڈاکٹر عبدالسلام نے بالترتیب بیالوجی اور فزکس کے شعبے میں اپنی خدمات کی بدولت یہ انعام پایا، جبکہ تیسرا نوبیل انعام سوات کی طالبہ ملالہ یوسفزئی کو امن کے شعبے میں دیا گیا ہے، یہ ایک المیہ ہے کہ مختلف دہائیوں میں انعام پانے والے، ان تینوں افراد کو جب نوبیل پرائز سے نوازا گیا تو یہ پاکستان چھوڑ کر بیرون ملک جا چکے تھے۔ دونوں سائنسدان تو یہ دنیا بھی چھوڑ چکے ہیں جبکہ ملالہ یوسف زئی نے گزشتہ دنوں برطانوی شہریت حاصل کرلی ہے، چند سال قبل طالبان کی طرف سے کیے گئے قاتلانہ حملہ میں معجزانہ طور پر بچ جانے کے بعد وہ برطانیہ میں رہائش اختیار کیے ہوئے ہے۔ سوچتا ہوں کہ عالمی شہرت کے حامل یہ نوبیل انعام یافتگان پاکستانی اگر ملک چھوڑ کر نہ جاتے تو پاکستان کو ان باصلاحیت افراد سے بہت فائدہ پہنچتا۔ میں کسی مذہبی وسیاسی بحث کو ہوا دینا نہیں چاہتا۔ بس ایک سادہ سی خواہش کا اظہار کرنا چاہتا ہوں، کہ جب چوتھے اور پانچویں پاکستانی کو نوبیل انعام سے نوازا جائے تو اسے ترک وطن نہ کرنا پڑے۔ ہمارے معاشرے میں اتنی برداشت پیدا ہو جائے کہ رنگ، نسل، مذہب مسلک، اور لسانی اختلاف کے باوجود لوگ پرامن طریقے سے اکٹھے رہنا سیکھ لیں۔ پاک سرزمین کی مٹی سے جس شخص کا بھی خمیر اٹھا ہے، میرے نزدیک ریاست پاکستان پر اس کا میرے برابر حق ہے، اور یہ حق اس سے کوئی بھی نہیں چھین سکتا۔ چاہے اس شخص کا خاندانی پس منظر اور نظریات کچھ بھی ہوں۔

جاپان کے دور افتادہ ساحلی شہر کی ندی کنارے واقع محلے میں جب کبھی میں نوبیل انعام یافتہ مذکورہ سائنسدان پروفیسر کو دیکھتا ہوں، تو دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ کاش پاکستان کے گلی کوچوں میں بھی ایسے اعلیٰ دماغ پرسکون اور نارمل زندگی گزار سکیں۔ اپنی عظمت کے خراج کے طور پر انہیں اپنی دھرتی نہ چھوڑنی پڑے۔

ایسے تو کوئی ترک سکونت نہیں کرتا
ہجرت وہی کرتا ہے جو بیعت نہیں کرتا

دوسری جنگ عظیم میں جس چیز نے امریکہ کو اپنے اتحادیوں اور حریفوں پر فیصلہ کن برتری دلائی وہ ایٹم بم تھا۔ ستم ظریفی دیکھیے کہ جس آئین سٹائین نے ایٹم بم ایجاد کیا وہ خود جرمن یہودی تھا، جرمنی میں ہی پلا بڑھا، اور تادم مرگ اپنا تمام تحقیقی کام جرمن زبان میں ہی کرتا تھا، ہٹلر کی تنگ نظری نے دیگر یہودیوں کی طرح اسے بھی ترک وطن پر مجبور کر دیا تھا۔ میرا خواب ہے کہ آئندہ جس پاکستانی کو نوبل پرائز ملے وہ ترک سکونت کی بجائے کسی تعلیمی ادارے میں نوجوان طلباء کو اپنا علم منتقل کرے۔ دانش وحکمت کو پھیلائے۔ اس طرح چراغ سے چراغ جلتا رہے اور پاکستان میں روشنیوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ قائم ہو جائے۔

ارژنگ: آپ کی پیدائش کہاں ہوئی، تعلیم کہاں کہاں سے حاصل کی؟

ج: میری پیدائش لاہور میں ہوئی۔ میرے والد پروفیسر شیخ عبدالکریم مرحوم جن کا تعلق سیالکوٹ سے تھا، میٹرک کے بعد لاہور منتقل ہو گئے تھے اور بقیہ تعلیم اسلامیہ کالج لاہور سے حاصل کی۔ ایم ایس سی کیمسٹری کے بعد وہیں درس وتدریس سے منسلک ہو گئے۔ اپنی وفات کے وقت وہ صدر شعبہ کیمیا تھے۔ ان کی کتب کریمز کیمسٹری، کریمز آرگینک کیمسٹری، کریمز ان آرگینک کیمسٹری اور کریمز پریکٹیکل کیمسٹری سے ہندوؤں اور مسلمانوں نے بیک وقت استفادہ کیا۔

ارژنگ: آپ بالحاظِ تعلیم انجینئر ہیں۔ صحافت سے منسلک ہیں اور کلاسیکل گائیک بھی ہیں۔ اس سفر میں کس شعبے میں زیادہ دلچسپی ہے؟

ج: میں نے لاہور اسکولز میں 1960ء میں اول اور سنٹرل ماڈل سکول لاہور میں بھی اول پوزیشن حاصل کی تھی۔ موسیقی سے شغف قدرتی تھا۔ سکول کے بزم اقبال، بزم ادب اور دیگر تقاریب میں حصہ لیا تھا۔ رجحان آرٹس کے مضامین کی طرف تھا۔ میرے والد نے مرنے سے قبل (اُن کی وفات 15 مئی 1959ء کو ہوئی) میری والدہ ممتاز بیگم جو کہ خواجہ دل محمد، ریاضی دان وقومی شاعر کی دختر تھیں، سے وعدہ لیا تھا کہ وہ مجھے انجینئر بنائیں۔ ان کی خواہش کے احترام میں گورنمنٹ کالج لاہور سے پری انجینئرنگ کے بعد مجھے یونیورسٹی آف انجینئرنگ کی ڈگری مل گئی۔ وہیں لیکچرار لگ گیا اور 1968ء میں برمنگھم یونیورسٹی یوکے میں اعلیٰ تعلیم کے لیے روانہ ہو گیا۔ 1969ء میں ایم ایس سی اور 1972ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگریاں لے کر اکتوبر 1972ء میں وطن واپس آ گیا۔

ساری عمر انجینئرنگ میرا پروفیشن اور موسیقی میرا جنون (Passion) رہا ہے۔ یو ای ٹی سے لے کر یوکے تک تعلیم کے دوران میوزک کنسرٹس کا انعقاد کرتا اور اُن میں بھرپور حصہ لیتا رہا۔ یو ای ٹی میں اور گورنمنٹ کالج لاہور میوزک سوسائٹی کا فعال ممبر رہا۔ یوکے میں قریباً تمام یونیورسٹیوں میں پاکستان ڈے کی تقاریب میں حصہ لیا۔ سفارت خانہ یوکے نے مجھے غالب کی صد سالہ تقریبات میں حصہ لینے کے لیے لندن میں نامزد کیا۔ جبکہ بھارت کی طرف سے اوم پرکاش اور راجندر سنگھ بیدی نامزد تھے۔ میں نے غالب کی غزلیں گائیں۔ وہیں پر بی بی سی کے اسٹیشنز کے لیے پروگراموں میں حصہ لیتا رہا۔ لکھنے کا کام 1987ء میں شروع کیا۔

ارژنگ: آپ نے گائیکی کا آغاز کب کیا؟ آپ کے استاد کون ہیں؟

ج: گائیکی کا آغاز اسکول، کالج اور یونیورسٹیوں کی مجالس میں ہو گیا تھا۔ ریڈیو پاکستان لاہور میں 'ہونہار' بچوں کے پروگرام میں آپا شمیم (موہنی حمید) اور بھائی جان (فاروق علی خاں) میں بحیثیت چائلڈ سٹار بحیثیت گلوکار ابتدا ہوئی۔ پھر وقت کے ساتھ ساتھ آؤٹ سٹینڈنگ کیٹگری شامل ہو گیا۔ پی ٹی وی کے ابتدائی دنوں سے اب تک اس کے موسیقی کے پروگراموں میں شمولیت کرتا رہا۔ وہاں پر میرے پروگرامز آئیڈیا ''سنگت'' (1972-73) اور ''دیس پریس'' (1996) پر کامیاب پروگرام ہوئے اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ موسیقی کی کہانی لمبی ہے۔ کسی اگلی نشست پر بقیہ گزارشات پیش کروں گا۔

جہاں تک میرے اساتذہ کا تعلق ہے، میں نے پاکستان کے بیشتر موسیقاروں کی دُھنیں گائی ہیں۔ اس لحاظ سے وہ تمام موسیقار میرے استاد ہیں۔ میں نے زیادہ تر دھنیں موسیقاروں میاں شہریار اور اختر حسین اکھیاں کی گائی ہیں۔ ہلکی پھلکی موسیقی یعنی کہ گیت، غزل اور کافی گانے میں وہ میرے استاد ہیں۔ موسیقاروں بخشی وزیر اور ماسٹر منظور حسین بھی ایک اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔ 1972ء میں وطن واپسی پر مشتاق ہاشمی اور میں نے شام چوراسی کے نمائندہ کلاسیکل گائیکوں، استاد نزاکت علی خاں اور استاد سلامت علی خاں کی شاگردی اختیار کی۔ پھر 1993ء میں اُسی گھرانے کے استاد غلام شبیر خاں، استاد غلام جعفر خاں سے کسب فیض کیا۔ حال ہی میں استاد غلام شبیر خاں کے انتقال کے بعد ان کی میوزک اکیڈمی پاکستان میوزک سنٹر، میٹروپول سینما لاہور میں، ہم سب شاگرد اسی طرح ریاض کرتے ہیں، جس طرح کہ ان کی زندگی میں کیا کرتے تھے۔

ارژنگ: کون سے نغموں کو زیادہ شہرت ملی؟

ج: چونکہ گائیکی کی ابتدا لوک گیتوں سے کی تھی۔ اس لیے اس حوالے سے مندرجہ ذیل لوک گیت آج بھی مقبول ہیں جنہیں مشہور لوک گائیک حامد علی بیلہ صاحب سے سیکھا تھا۔

تیرا لٹیا شہر بھنبھور نی سسّیئے بے خبرے
اوڑک جاناں مر وے چل میلے نوں چلیے
سیئو نی لالیاں بے پرواہ دے نال (کافی)
کینویں گوری چلدی اے سپنو لیے دی چال وغیرہ

اگرچہ ریڈیو اور پی ٹی وی پر بے شمار غزلیں، گیت اور پنجابی کلام گایا ہے۔ مگر مندرجہ ذیل نغموں کو زیادہ شہرت ملی۔

جو بھی کچھ ہے محبت کے پھیلاؤ ہے (نظم: امجد

اسلام امجد) تفہیم، ایک محبت سوافسانے، تحریر: اشفاق احمد، پی ٹی وی)

ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں ہر کام کرنے میں (منیر نیازی، پی ٹی وی پروگرام. ماہنامہ، پروڈیوسر: محمد عظیم)

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک (کلام: غالب، موسیقی: شہریار پی ٹی وی پروگرام: انداز اپنا اپنا، پیشکش: فرخ بشیر)

اجنبی بن کے نئے روگ لگانے آؤ (غزل: شہزاد جالندھری، موسیقی: ماسٹر منظور، سی پی یو، ریڈیو پاکستان، لاہور)

میری تصویر میں رنگ اور کسی کا تو نہیں (موسیقی: ماسٹر منظور، سی پی یو، ریڈیو پاکستان، لاہور غزل: مظفر وارثی)

مجھ پہ طوفاں اُٹھائے لوگوں نے (غزل: داغ دہلوی، پی ٹی وی پروگرام غزل اس نے چھیڑی، موسیقی: استاد ضمیر احمد خاں، پیشکش: شوکت زین العابدین)

رنج کھینچے تھے داغ کھائے تھے (غزل: میر تقی میر، موسیقی: شہریار، پروگرام: محفل پی ٹی وی) وغیرہ

ارژنگ: کیا گانا زیادہ پسند کرتے ہیں کافی، غزل، گیت یا کلاسیکل راگ؟

ج: ہر صنف کو گاتا ہوں محبت سے۔ میری لاؤ (Live) کنسرٹس کلاسیکی گائیکی سے شروع ہو کر غزلوں، گیتوں، فلمی گانوں، کافیوں اور لوک گیتوں تک محیط ہوتی ہیں۔ اگرچہ ہلکی پھلکی موسیقی کی تمام اصناف تمام عمر گاتا رہا لیکن کلاسیکل خیال کی گائیکی باقاعدگی سے 1990ء کی دہائی سے ریڈیو اور ٹیلی ویژن اور اسٹیج پر شروع کر دی۔ ایک مرتبہ آل پاکستان موسیقی کانفرنس کے بانی سیکرٹری جنرل حیات احمد خان نے مجھے جب اپنی ایک ماہانہ محفل میں گانے کے لیے مدعو کیا تو یہ حکم فرمایا کہ ''امجد اب کلاسیکل موسیقی ہی گایا کریں گے۔'' اس لیے اب میں خیال کی گائیکی کو ترجیح دیتا ہوں۔ روزانہ ریاضت سے دیگر اصناف موسیقی میں گائیکی کے اظہار میں مزید سریلا پن، نکھار اور مٹھاس پیدا ہو جاتی ہے۔

ارژنگ: آپ کو دیگر کئی ممالک بہت شوق سے سنا جاتا ہے۔ دوسرے ممالک میں ہماری موسیقی کو کیا مقام حاصل ہے؟

ج: دراصل آدھی دنیا کی سیر کا میں موسیقی کا مرہونِ منت ہوں۔ لیکن اپنے انجینئرنگ کے کاموں کے سلسلے میں جب بھی بیرونِ ملک جاتا وہاں پرائیویٹ اور حکومتی ادارے بمع سفارت خانہ پاکستان میرے ساتھ محفلیں برپا کرتے رہتے تھے۔ امریکہ، انگلستان، یورپ کے بیشتر ممالک اور خلیج میں بہت اسٹیج شوز ہوئے۔ یہ سلسلہ جاری و ساری ہے۔ لیکن چند شوز یادگار ہیں جیسا کہ 1998ء میں میانمار (برما) کے دارالخلافہ ینگون (رنگون) میں سفیر پاکستان کا پاکستان کے جشن آزادی پر مجھے مدعو کرنا تھا۔ محترمی جاوید حفیظ، سفیر پاکستان نے میرے اعزاز میں چار فنکشنز کا اہتمام کیا۔ سب سے بڑا شو ایک ہزار سے زائد سامعین کے سامنے ایک بہت بڑے آڈیٹوریم میں منعقد ہوا جہاں وزیر ثقافت مہمانِ خصوصی تھے۔ شو شام چھ بجے شروع ہوا اور بارہ بجے شب اختتام پذیر ہوا۔ سننے والے وہ لوگ تھے جن میں سے زیادہ تر قیامِ پاکستان سے پہلے ہی برما منتقل ہو گئے تھے۔ دوسرے شوز میمن برادری کے ساتھ میمن کلب میں منعقد ہوئے۔ وہ دور پرسکون دور تھا جو آج کل کے دور سے متضاد ہے۔ میری یادوں میں باغات، ہریالی، پگوڈے (Pagodas) اور پرندوں کی چہچہاہٹ اور کوئل کی کوکو اب تک تر و تازہ ہیں۔

اورینٹل سٹار انجینئرز کے مالک اور موسیقی کے پروموٹر محمد ایوب اور ان کے بھائیوں محمد فاروق اور محمد یونس (اب مرحوم) سے میرا تعلق 1968ء سے ہے۔ میری طالب علمی کے دور میں انہوں نے اپنی کمپنی کا پہلا ریکارڈ میری اور مشتاق ہاشمی کی آواز میں ریلیز کیا۔ اس کے بعد کئی محافل موسیقی (مشہور شاعر ڈاکٹر صفی حسن کے ہمراہ) کا انعقاد کیا۔ پھر موسیقار خیام کی دھنوں میں ترتیب دی ہوئی میری آڈیو سی ڈی ''تیرا انتظار'' ریلیز کی۔ اس کے بعد ڈاکٹر صفی حسن کی شاعری پہ مبنی میری اور عابدہ پروین کی آواز میں آڈیو سی ڈی ''جاناں'' بھی ریلیز کی۔ ایک سی ڈی ''تیرے نام'' حمد و نعت پر مشتمل ہے۔

جہاں تک بیرونِ ملک پاکستانی موسیقی کی مقبولیت کا تعلق ہے ہم لوگ (آرٹسٹ) دیانتدار اور مستند پروموٹرز کے فقدان کا شکار رہے ہیں۔ بھارت سے ہر دور میں طائفے جاتے رہے ہیں اور بھارتی لوگ ان کے شوز جوق در جوق دیکھنے جاتے ہیں۔ پاکستانی گلوکاروں کے شوز پر بھارتی شائقین نہیں جاتے۔ ماسوائے استاد نصرت فتح علی خاں، راحت فتح علی خاں اور کسی حد تک عاطف اسلم کے شوز پر۔ وہ بھی اس لیے کہ یہ گائیک بھارت کی فلم انڈسٹری میں اپنے فن کا لوہا منوا چکے ہیں۔

ارژنگ: موسیقی کو روح کی غذا کہا جاتا ہے۔ آپ کے نزدیک موسیقی کی کیا تعریف ہے؟

ج: وہ موسیقی جو ذہن کو سکون اور روح کو راحت دے۔ وہ واقعی روح کی غذا ہے لیکن وہ موسیقی جو فقط دھما چوکڑی پر مشتمل ہو وہ سوائے فشارِ خوں بڑھانے کے کوئی اور کام نہیں کر سکتی۔ برصغیر میں 1950ء سے 1990ء کی دہائیوں تک فلمی اور غیر فلمی موسیقی میں سریلے موسیقار اور گائیک موجود تھے۔ باکمال گانے کمپوز ہوئے۔ اس کام کو زندہ رکھنے کی خاطر میں نے ''میلوڈی میکرز'' 47 موسیقاروں اور میلوڈی سنگرز.

27 گلوکاروں پر مشتمل انگریزی اور اردو میں کتب تحریر کی ہیں اور ان کی اگلی کتابیں زیرِ تحریر ہیں جن میں ان عظیم موسیقاروں اور گلوکاروں پر میری تحقیق شامل ہے، جو پہلی کتب میں شامل نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ پلاک (PILAC) میری کتاب فوک لیجنڈز آف پنجاب بھی شائع کر رہی ہے۔ سریلے سنگت کو پروموٹ کرنے کے سلسلہ میں پانچ سال FM95 پر پروگرام کیا اور گزشتہ تین برس سے ریڈیو پاکستان کے FM93 اور MW630 چینلز پر ہر جمعرات کی شب گیارہ بجے تک 'ہمارے موسیقار' پروگرام میں میلوڈی میکرز اور ان کے کام پر گفتگو کرتا ہوں اور ان کی موسیقی میں ترتیب دیے ہوئے نغمے پیش کرتا ہوں۔ یہ ایک پاپولر پروگرام ہے۔

ارژنگ: کلاسیکل موسیقی اور جدید موسیقی میں کسے زیادہ پسند کرتے ہیں اور کیوں؟

ج: دونوں اصناف میں اگر سریلی گائیکی یا سازینہ ترتیب دیا گیا ہے وہ پسند ہے۔

ارژنگ: کیا جدید پاکستانی موسیقی عالمی سطح پہ اپنی کوئی شناخت رکھتی ہے؟

ج: نہ بھارتی اور نہ ہی پاکستانی۔ جدید موسیقی اپنی کوئی شناخت بنا سکتی ہے کیونکہ مغربی دنیا یا افریقہ کے سازوں کا اپنا انداز ہے۔ ان کے پاپ گیت، ان کی اپنی زبان اور ردھم سے مطابقت رکھتے ہیں۔ ہم ان کی نقل نہیں کر سکتے۔ ہمارا پاپ میوزک، ہماری لوک اور ہلکی پھلکی موسیقی میں موجود ہے۔

ارژنگ: آپ ایک بڑے سرکاری عہدے کے ایم ڈی بھی رہے ہیں اور آپ نے سات کتب بھی تصنیف کی ہیں۔ نوکری کی بھاری ذمہ داری کے ساتھ ساتھ لکھنے کے لیے کیسے وقت نکالا؟

ج: انسان کو جس کام سے عشق ہو، اس کے لیے وقت نکل ہی آتا ہے، چاہے وہ چوبیس گھنٹوں میں مختلف اوقات پر محیط ہو۔

ارژنگ: کیا آپ کی کتب کے تراجم بھی ہوئے ہیں؟

ج: جی ہاں! انگریزی سے اردو میں۔ میلوڈی میکرز کا بیشتر حصہ پروفیسر انیس اکرام فطرت نے اردو میں ترجمہ کیا تھا۔

ارژنگ: کیا آپ کو کوئی ایوارڈ بھی ملا ہے؟

ج: عوام اور دوستوں کی محبت ہی میرا سب سے بڑا انعام ہے۔ لیکن مجھے خوش قسمتی سے انجینئرنگ اور موسیقی میں صدر پاکستان کے انعامات ملے ہیں۔ 1976ء میں صدر پاکستان کا گولڈ میڈل (انسٹی ٹیوشن آف انجینئرنگ پاکستان کی طرف سے) اور 2000ء میں پرنٹ آف پارفارمنس (تمغہ حسن کارکردگی) موسیقی میں۔

انجینئرنگ میں ڈاکٹر اے کیوں خان لائف اچیومنٹ ایوارڈ بھی ملا ہے۔

ارژنگ: آج کل انٹرنیٹ کا دور ہے۔ کیا آج بھی ریڈیو کے سامعین موجود ہیں؟

ج: جی ہاں! ایف ایم ریڈیو بڑے شہروں میں اور پورے پاکستان کے دیہاتوں، قصبوں اور پہاڑی علاقوں میں سنا جاتا ہے۔ یہ ایک بہت روایتی اور مضبوط ذریعہ اطلاعات و مواصلات ہے۔

ارژنگ: صحافت موسیقی سے الگ تھلگ شعبہ ہے۔ صحافت کا سفر کیسے شروع کیا؟

ج: میں کوئی سماجی یا سیاسی صحافت نہیں کرتا۔ میرے کالم موسیقی اور ادب پر ہوتے ہیں اور میں انگریزی زبان میں لکھتا ہوں۔ گزشتہ چند برسوں سے ڈیلی ٹائمز لاہور میں میرے مقالے شائع ہوئے ہیں۔

1986ء سے 1992ء تک میں ریاض، سعودی عرب میں نیسپاک (Nespak) کا جنرل منیجر تعینات تھا۔ وہاں پر میرے ایک دوست عزت مجید، وزارتِ پٹرول میں مشیر کے عہدے پہ فائض تھے۔ ہماری وجہ دوستی موسیقی تھی۔ جب کشور کمار، بھارتی گلوکار کی وفات ہوئی تو میں نے اس پر ایک تعزیتی کالم لکھا۔ عزت مجید نے اسکوڈیلی نیشن کے ایڈیٹر عارف نظامی کو بھیج دیا۔ وہ چھپ گیا۔ اس طرح میری موسیقی پر لکھنے کی کاوشیں تواتر سے اس اخبار میں چھپنا شروع ہو گئیں۔ پھر جب عارف نظامی نے اس اخبار سے علیحدگی اختیار کی تو مجھے راشد رحمان صاحب، ایڈیٹر ڈیلی ٹائمز کی طرف بھیج دیا۔ وہ دن آج کا دن اسی اخبار میں موسیقی اور ادب پر لکھتا ہوں۔

ارژنگ: آپ کی تین کتب لٹریچر پر ہیں۔ ان کے محرکات اور تفصیل سے آگاہی کریں۔

ج: کتب بینی کا ہمارے گھر میں شروع سے ہی رواج تھا۔ ہم سب بہن بھائی انگریزی اور اردو شاعری اور فکشن کی کتابیں پڑھتے تھے۔ میرے نانا خواجہ دل محمد نے میری والدہ کو جہیز میں ایک لائبریری بھی دی تھی۔ پھر بحیثیت چائلڈ سٹار ان کے ہاں مشاعروں کی ابتدا میری آواز میں کلام اقبال یا کلامِ خواجہ دل محمد سے ہوتی۔ میں جب بھی کوئی کتاب پڑھتا، اس کے مثبت پہلوؤں کو اجاگر کر کے لکھتا۔ اب تک سینکڑوں کتابوں پر میرے تبصرے شائع ہو چکے ہیں۔ میری تصانیف کے نام ہیں:

(۱) سمفنی آف ریفلیکشنز
(Symphony of Reflections)
(۲) رین بو آف ریفلیکشنز
(Rainbow of Reflections) اور
(۳) پرلز آف ریفلیکشنز اور
(Pearls of Reflections)

انٹرویو......ناز بٹ

سوال: سب سے پہلے تو اپنے ادبی اور سوانحی پس منظر سے آگاہی دیجئے

ناز بٹ: میرا تعلق کراچی اور لاہور دونوں شہروں سے ہے، 15 اکتوبر کو لاہور میں پیدا ہوئی، ابتدائی تعلیم کراچی سے حاصل کی، سینٹ پیٹرکس کالج سے انٹر سائنس، کراچی یونیورسٹی سے گریجویشن کرنے کے بعد لاہور سے ایم اے انگلش کیا، نہایت ادبی ماحول میں پرورش ہوئی، والد صاحب شاعر تھے اور پیشے کے اعتبار سے انجینئر، جبکہ والدہ درس و تدریس کے شعبہ سے وابستہ تھیں والد صاحب انتہائی باذوق شخصیت کے مالک تھے انہیں عربی اور فارسی پر بھی عبور حاصل تھا اور اقبال سے عشق بھی۔۔۔ سو نہایت غیر محسوس طریقے سے انہوں نے ؟ اقبال کو ہماری زندگیوں میں شامل کر دیا، یوں سمجھیں کہ اسکول کی کتابوں کے ساتھ ساتھ بانگِ درا، بالِ جبریل، ارمغانِ حجاز، شکوہ جوابِ شکوہ، پیامِ مشرق اور جاوید نامہ کے درمیان آنکھ کھولی، والدہ شام میں ہمیں اسکول کے ہوم ورک کی تیاری کرواتی تھیں جبکہ رات کو والد صاحب ہوتے تھے، اقبال اور ہم بہن بھائی۔۔۔۔وہ اقبال کے اردو اور فارسی کلام کے ایک ایک مصرع کی تشریح اور تفسیر ہمیں اس طرح سمجھاتے تھے کہ ازبر ہو جاتا اور میرا دل کرتا تھا کہ یہ سیشن کبھی ختم نہ ہو، مصوری سے میری دلچسپی بھی والد صاحب کی طرف سے وراثت میں ملی

ذہین طالبہ رہی، اسکول اور کالج کے زمانے میں نصابی و غیر نصابی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا بلکہ اسکول کالج کی نمائندگی بھی کرتی رہی اور انعامات بھی حاصل کئے، اردو انگریزی تقریری مقابلوں میں بھی اپنے کالج کی نمائندگی کرتی رہی، ایتھلیٹ بھی تھی، والدہ کی خواہش پر کراٹے کلاسز جوائن کیں اور بلیو بیلٹ حاصل کی

سوال: ادب سے لگاؤ کے بارے میں بتائیے، کب سے شعر کہہ رہی ہیں اور باقاعدہ شاعرہ ہونے کا احساس کب ہوا؟

ناز بٹ: ادب سے لگاؤ کا کیا کہا جائے۔۔۔۔آپکو بتایا کہ اٹھان ہی ایسے ماحول میں ہوئی، کتابوں سے محبت کرنا ہماری گھٹی میں شامل تھا، والد صاحب شاعر تھے سو نہ صرف شاعری کا جنون انکی طرف سے میرے خون میں شامل ہے بلکہ مصوری کی صلاحیت بھی والد صاحب ہی کی طرف سے ہی منتقل ہوئی

اور جہاں تک بات ہے شعر کہنے کی تو کچھ پتہ نہیں کب سے شعر کہہ رہی ہوں، میرا سارا بچپن، لڑکپن تعلیمی دور سمندر کی لہروں سے عشق میں گزرا، آٹھ دس دن بعد سمندر کی سیر کو جانا معمول تھا، سب گھر والے سمندر انجوائے کرتے تھے اور میں سمندر سے کچھ فاصلے پہ کھڑی سمندر کی اداسی، خوشی اور تنہائی اپنے اندر اتارا کرتی تھی، مجھے چپ سی لگ جاتی تھی سمندر کو دیکھ کر، یہ کیفیت آج بھی اسی طرح ہے، آج بھی سمندر سے والہانہ عشق ہے، خیر بات اسکول کے دور کی ہو رہی ہے تو میں واپس جا کر اپنی ساری کیفیت کو اپنی ڈائری میں اتار کر آنکھیں موند لیا کرتی تھی، احساس بھی نہیں تھا کہ کیا لکھا، کیوں لکھا، بس لکھنے کی بےچینی اور لکھنے کے بعد سکون۔۔۔۔پھولوں تتلیوں، تاروں کی باتیں خوشبو سے عشق۔۔۔۔۔۔تمام سرگوشیاں ڈائری سے

والد صاحب نے ایک دن ڈائری دیکھی تو محبت سے ماتھا چوم لیا، درحقیقت ڈائری میں اپنی کیفیات سے میں ٹوٹی پھوٹی نظمیں تشکیل کیا کرتی تھی جس کا مجھے اِدراک تک نہیں تھا، میری اس ڈائری کے کچھ صفحات آج بھی میرے پاس محفوظ ہیں

میر، درد، غالب، آتش، حسرت کو اسکول کے زمانے میں پڑھا اور خوب پڑھا، بلکہ ایک ایک شعر کی چار چار صفحات پر تشریح کر کے ٹیچر کو حیران کرنا معمول تھا، اچھا لگتا تھا جب وہ کہتی تھیں ناز تمہارے اندر "شاعری کے جراثیم "بہت زیادہ ہیں، بس تو پھر غیر ارادی طور پر اشعار بھی ہو جاتے، اس وقت قافئے اور وزن کی تو اتنی سمجھ نہ تھی، لیکن معصومیت کا یہ حال تھا کہ ذہن میں ایک ردھم سی بنا کر یہ خیال رکھتے ہوئے کہ ردھم میں سانس ٹوٹنے نہ پائے صرف ردیف کی پابندی کے ساتھ پانچ چھ اشعار کہہ کر اپنے تئیں خود کو بڑی شاعرہ تصور کر لیا جاتا کہ چلو جی "غزل "ہو گئی، فرسٹ ائر میں ایڈمیشن لیا تو والد صاحب ہمیشہ کے لئے ساتھ چھوڑ گئے، دنیا اندھیر ہو گئی، اور یوں ہوا کہ پھول خوشبو اور سمندر کے حُسن کی جگہ آنسوؤں اور آہوں اور سسکیوں نے لے لی، غم کی شدید کیفیت میں غزل ہوئی جس کا ایک شعر جسے میں اپنا پہلا باقاعدہ شعر مانتی ہوں "زندگی شامِ الم کی وسعتوں کا نام ہے

زندگی بے درد کانٹوں کے سوا کچھ بھی نہیں"

کبھی کبھار اپنی کوئی نظم اخبار میں بھی بھیج دیا کرتی تھی

فیض، میرا، نون میم راشد، فراز، امجد اسلام امجد صاحب، ناصر کاظمی اور پروین شاکر کی شاعری سے عشق ہوا جو آج بھی اسی طرح ہے محسن نقوی کو بہت پڑھا، ساغر صدیقی کو پڑھ پڑھ روتی تھی، پروین شاکر اور امجد اسلام امجد صاحب کی نظمیں میرے اندر بستی ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔وقت کے ساتھ ساتھ شاعری کا جنون بھی پروان بھی چڑھتا رہا اور نکھار بھی آتا گیا، موقر ادبی جرائد میں کلام چھپتا بھی آیا ہے

سوال: اپنی تصانیف کے بارے میں بتائیے گا ؟

جواب: حرف لفظوں میں، اور لفظ شعروں میں کب ڈھلنے لگے پتہ ہی نہ چلا البتہ لفظوں کو بینت بینت کے رکھنے کا عمل "وارفتگی" کا موجب ٹھہرا، نظموں اور غزلوں پر مشتمل میرا شعری مجموعہ "وارفتگی" منظر عام پر آچکا ہے جبکہ نظموں کا ایک مجموعہ پائپ لائن میں ہے

سوال: شاعری کیا ہے؟ نظم یا غزل دونوں میں سے آپ سہولت کہاں محسوس کرتی ہیں اور اس سہولت کی وجہ؟

ناز بٹ: شاعری عطیہ خداوندی ہے، آمد ہے، ایسی عطا ہے جو خاص لوگوں کو ودیعت ہوتی ہے، رومنز تو شاعری کو الہام کا درجہ دیتے تھے---

شاعری بشر کے ذاتی، وجدانی المیہ کا بیان ہی تو ہے-------شاعری جیسے دیوار گریہ کی تلاش-------یہ میرا عشق بھی ہے جنون بھی-------------میرے اندر کی صداقتوں کے اظہار کا ذریعہ بھی-------------میرے اندر کی سچائیوں کو کائنات سے ہم آہنگ کرنے کی سعی بھی-----روح و بدن میں پھیلتی محبت کی سرشاری بھی اور قطرہ قطرہ زندگی سے زہر کشید کر کے------رخصت کی راہ بھی اور احساسات و جمالیات کا اظہار یہ بھی---وہ جو دل کے اندر اک دنیا ہوتی ہے نا، اس کا سکون بھی-----

میں سمجھتی ہوں کہ خیال اپنی ساخت ساتھ لاتا ہے، سوچ سمجھ کر یا ارادتاً کچھ نہیں ہوتا، بس کیفیت ہوتی ہے کبھی قرطاس پر بکھرتے بکھرتے نظم کی صورت اختیار کر لیتی ہے تو کبھی دو مصرعوں میں آپکے خیال یا کیفیت کی مکمل ترسیل ہو جاتی ہے، دراصل غزل دو کناروں کے درمیان کا سفر ہے--------جبکہ نظم سمندر کا سفر ہے جانے کب کہاں بہالے جائے آپکی کیفیت آپکو------ آپ کب ڈوبتے ہو کب ابھرتے ہو کچھ پتہ نہیں چلتا--------بس لہروں کے مدوجزر پر-------رواں! مزاج چونکہ نظم سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے سو سمندر کی لہروں کا سفر زیادہ سرشار کرتا ہے

اک بے کلی سی، اداسی، اضطراب ہمیشہ ساتھ رہتا ہے لیکن جب میں اپنے اندر کی کیفیت کو لفظوں ڈھال لیتی ہوں تو اداسی کی کیفیت سے نکل آتی ہوں اور کئی کئی دن تک اپنی تخلیق کے سرور میں رہتیں ہوں!

سوال: آپ نثر نگار بھی ہیں شاعر بھی، شاعری زیادہ مرغوب ہے یا نثر؟

ناز بٹ: یہ تو بالکل ایسا ہی سوال ہے کہ گڑیا زیادہ عزیز ہے یا سلمان، منا!

سوال: آپ اخبار سے منسلک رہی ہیں ایک کامیاب مدیر رہی ہیں، اب یہ بتائیے کہ صحافت میں دلچسپی کب اور کیسے ہوئی؟ کالم لکھنے کب شروع کیے؟

ناز بٹ: شعیب بن عزیز صاحب نے خاصہ زور دیا کالم لکھنے پر کہ آپکی نثر بہت اچھی ہے کالم لکھا کریں، گھر سے بھی یہی آواز تھی، سعید آسی صاحب نے کالم لکھنے کی ترغیب بھی دی اور تحریک بھی، سو نوائے وقت میں کالم لکھنے شروع کر دئیے، صحافت میں کچھ خاص دلچسپی تو نہ تھی لیکن بس باتوں باتوں میں ہی اخبار سے منسلک ہوگئی، سنڈے میگزین کی مدیر کی ذمہ داری سنبھالی اور اپنے مزاج میں نفاست اور پرفیکشن کی وجہ سے بہت کامیاب بھی رہی، کیونکہ کنٹنٹ اور معیار پر کبھی سمجھوتہ نہیں کیا

سوال: آپ کو بطور خاتون لکھاری میدان ادب میں کسی قسم کی مشکلات درپیش آئیں؟ اگر ایسا ہے تو کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا؟

ناز بٹ: ایک تو عورت ہونا------اس پر اس کا تخلیقکار ہونا اور وہ بھی بغیر کسی ''استاد'' کے-----------مشکلات کا باعث تو بنتا ہی ہے دراصل ہمارے معاشرے میں مردوں کا ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو عورت کو اسیر دیکھنے میں ہی اپنی ذہنی تسکین حاصل کرتا ہے، گو وہ عورت ان کو کسی خاطر میں ہی نہ لائے---------!

اللہ کا شکر ہے کہ مجھے گھر سے تو کبھی بھی کسی قسم کی رکاوٹ یا مشکلات کا سامنا نہیں ہوا، اور باہر کی مشکلات کو میں کسی گنتی میں اس لئے شمار نہیں کرتی کہ میری اپنی ایک سوچ ہے، مزاج، شعور اور معیار، میرے اپنے کچھ اصول بھی ہیں، میں اپنے مزاج کے خلاف کبھی نہیں جاتی اور اصولوں پر سمجھوتہ نہیں کرتی، اللہ پاک نے اچھے برے کی تمیز دی ہوئی ہے الحمد للہ! جو راستہ پسند نہ آئے وہاں ٹکراؤ کرنے کے بجائے خموشی سے پیچھے ہٹ جاتی ہوں، شہرت کے بجائے ہمیشہ اپنی عزت اور وقار کو ترجیح دی،

اکثر سنتی ہوں کہ تخلیق کار صرف تخلیق کار ہوتا ہے مرد یا عورت نہیں---یعنی gender کی تخصیص نہیں

-----لیکن میں ایک پل کے لئے بھی اپنے عورت ہونے کو نظرانداز نہیں کر پائی---------اور مجھے فخر بھی ہے اپنے عورت ہونے پر اور الحمد للہ جتنی عزت اور محبت اللہ پاک کے فضل و کرم سے مجھے ملی ہے اس کے لئے میں اللہ کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے

سوال: ذاتی تجربات و مشاہدات ایک فن کار کی تخلیقات پر کہاں تک اثر انداز ہوتے ہیں؟؟ دکھ کیا ہے؟؟ ذاتی؟ اجتماعی؟

ناز بٹ: میں بنیادی طور پر محبت کی شاعرہ ہوں-------کومل اور لطیف جزبوں کی شاعرہ----------- پھول، خوشبو، بادل، سردیوں کی بارش، سمندر، پہاڑ، خنک ہوائیں، فطرت کا حسن، محبت کی لطافت و سرشاری میرے ذوق جمالیات کی تسکین کرتے ہیں---------اور ایسے میں شاعری اترنے لگتی ہے، جتنی شدت سے کوئی کیفیت اترتی ہے اتنی ہی شدت سے وہ کیفیت

قرطاس پر منتقل ہوتی ہے
لیکن یہاں بات چونکہ دکھ کی ہے تو اتنا ہی کہوں گی کہ چونکہ انسانی سرشت زود رنج واقع ہوئی ہے اور اک شاعر کا احساس دوسروں کی نسبت زیادہ گہرا ہوتا ہے سو اسکی یہی حساسیت اسکے غم کو شدت بخشتی ہے اور غم کی یہ شدت اس کی شاعری کو جلا بخشتی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔مشاہدہ تجربے سے کہیں زیادہ طاقتور ہوتا ہے، تخلیق کار وہ سب کچھ دیکھ سکتا ہے جو ظاہری آنکھ نہیں دیکھتی۔۔۔۔سو
"خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر! "کے مصداق دل بھیگتا ہے، لفظ رونے لگتے ہیں۔۔۔۔آنکھیں بین کرنے لگتی ہی
بات چونکہ دکھوں کی ہو رہی تو اتنا ہی کہوں گی کہ دُکھ بھی کئی طرح کے ہوتے ہیں، دل میں پلتے، روح میں گھلتے، بدن میں پھیلتے، آنکھوں سے چھلکتے، قطرہ قطرہ پگھلتے دکھ!
دُکھ۔۔۔جو شاعر کے لئے اثاثہ بھی ہیں، نعمت بھی، اس کے لفظوں کا حُسن بھی اور شاعری کا نکھار بھی
سڑک کے کنارے چھوٹے بچے کے پھیلے ہوئے ہاتھوں کا دکھ، کوڑے پر بکھری پڑی زینب کی آہ و پکار کا دکھ، مکتب میں خون میں لتھڑے ہوئے گلابوں کا دُکھ، کہیں بوڑھے ماں باپ کے آگے نا خلف اولاد کی زبان درازی کا دُکھ، کبھی اپنے پیاروں کو اپنے سامنے سے جاتے ہوئے دیکھنے کا دُکھ۔۔۔۔۔۔
بوڑھے باپ کے کاندھے پر جوان بیٹے کی لاش کا دکھ، کشمیر، فلسطین، برما کے مسلمانوں کا دُکھ، اپنی عزت بچا کر دارالامان سے فرار ہونے والی سڑک پر پہنچی ہوئی اس سولہ سالہ بچی کا دکھ جو بھیڑیوں سے فریاد کر رہی تھی کہ مجھے میرے گھر بھیج دو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔
آہ!
بعض اوقات غم کی شدت انسان کو پتھر کر دیتی ھے۔۔۔آنکھیں آنسوؤں سے ہی مکر جاتی ہیں انسان کو درد کا احساس ھی نہیں ھوتا۔۔۔۔۔۔وجود سُن۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کوئی درد۔۔۔۔۔۔۔درد ھی نہیں لگتا، بلا کی حساسیت ہے میرے اندر۔۔۔۔۔۔۔جو عام زندگی میں تو نقصان پہنچاتی ہے مجھے، لیکن میرے قلم کو طاقت بھی دیتی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اور لفظوں کو شدت عطا کرتی ہے۔

سوال: ادب میں تنقید و تحقیق کی کیا اہمیت ہے، فروغ ادب کے لئے تنقید کہاں تک کارآمد ہو سکتی ہے؟

ناز بٹ: آج کل کے اکثر تنقیدی رویے سطحی ہیں، سامنے والے کو نیچا دکھانے کے لئے تنقید کا سہارا لے لیا جاتا ہے، اصل تنقید سے مراد ایسی صحت مند تنقید ہے جس میں اصلاحی پہلو نمایاں ہو، صحتمند تنقید تخلیق کار کے فن کو جلا بخشتی ہے

سوال: مشاعروں پر جو زوال آیا ہے اس کا ذمہ دار کون ہے؟ آجکل شاعری کے نام پر جو کچھ مشاعروں میں پیش کیا جا رہا ہے کیا آپ اس سے مطمئن ہیں؟؟ اور یہ بھی بتائیے کہ مشاعروں اور تقریبات میں کم کم شریک ہونے کی کوئی خاص وجہ؟

ناز بٹ: اس سوال کے جواب میں تو پوری کتاب لکھ سکتی ہوں مختصراً یہی کہ نہیں میں مطمئن نہیں ہوں حالانکہ میں نے بے شمار کل پاکستان اور بین الاقوامی "معیاری" مشاعروں میں شرکت کے ساتھ ساتھ ریڈیو اور ٹی وی چینلز کے مشاعروں میں بھی شرکت کی ہے، پڑوس ملک بھارت میں بھی پاکستان کی نمائندگی کر چکی ہوں لیکن دو تین سالوں سے بہت تبدیلی آ گئی ہے زیادہ تر مشاعرے اب سنجیدہ شاعری کا پلیٹ فارم ہی نہیں رہے، خود نمائی، خود ستائشی اور ڈرٹی پالیٹیکس کا شکار ہو چکے ہیں، شارٹ کٹس سے راتوں رات مشہور ہونے کے لئے مختلف قسم کے ہتھکنڈے استعمال کئے جا رہے ہیں، یہ سب کچھ دیکھ کر میں پیچھے ہٹ گئی، شکر میرے مالک کا کہ میرا یہ مزاج نہیں، میں کبھی بھی کسی بھی قسم کی دوڑ میں شامل نہیں رہی، کوئی لالچ کوئی ہوس نہیں، ہوس چاہے دولت کی ہو یا شہرت کی آنکھوں پر پٹی باندھ دیتی ہے۔۔۔۔۔انسان ایک اندھی دوڑ میں شامل ہو جاتا ہے اور الحمدللہ مجھے آنکھیں کھول کے چلنے کی عادت ہے، اور ویسے بھی اہمیت تو ہمارے لفظوں کی ہے، یہی لفظ ہماری پہچان ہیں، ہمارے بعد ہمارے لفظوں نے ہی زندہ رہنا ہے

سوال: لاہور رائٹرز کلب کے بارے میں بتائیے

ناز بٹ: تین برس قبل شعیب بن عزیز صاحب کی سرپرستی میں "لاہور رائٹرز کلب" کے نام سے ہم نے ایک ادبی تنظیم کی بنیاد رکھی، تنظیم کا نام بھی شعیب صاحب نے تجویز کیا، لاہور رائٹرز کلب کے صدر قمر رضا شہزاد صاحب، نائب صدر فرحت پروین، سکریٹری جنرل میں ہوں اور فنانس سکریٹری وسیم عباس ہیں، اپنے ذوق کی تسکین کے لئے اپنے اس پلیٹ فارم سے ہم معیاری ادبی تقریبات کا انعقاد کر لیا کرتے ہیں، ہماری اس تنظیم کا مقصد گروہ بندیوں سے بالاتر ہو کر صرف اور صرف جینوئن تخلیق کاروں کی تخلیقات کی پزیرائی اور حوصلہ افزائی ہے، ہم نے طے کر رکھا ہے کہ جو کام بھی کرنا ہے معیاری کرنا ہے

سوال: آخر میں ایک ذاتی سا سوال کہ آپ نے اس سارے سفر میں کیا کھویا کیا پایا؟ اور کیا اپنی زندگی سے مطمئن ہیں؟

جواب: زندگی نفع نقصان سے ماورا ہے اور قربان جاؤں اپنے اللہ کہ اس پاک ذات نے مجھے عزت، شہرت اور بے پناہ محبتوں سے نواز کر اک ذرے کو آفتاب کیا یہ سب تمہارا کرم ہے آقا کہ بات اب تک بنی ہوئی ہے

وحید ناز/لاہور

تم ایسا خوبرو دیکھا نہ کوئی　　　خدا نہ جھوٹ بلوائے کسی سے

اپنا احوال سنانے کی ضرورت کیا ہے
بے سبب دل کو جلانے کی ضرورت کیا ہے
مسئلہ جو بھی ہے آپس میں سلجھ سکتا ہے
بے وجہ روٹھ کے جانے کی ضرورت کیا ہے
تیری آنکھوں نے ہی مدہوش کیا ہے مجھ کو
اب کسی اور پیمانے کی ضرورت کیا ہے
تم نہیں تھے تو زمانہ تھا میری نظروں میں
تم ملے ہو تو زمانے کی ضرورت کیا ہے
ہر قدم پہ تمہیں دھوکہ ہی دیا ہے جس نے
راہنما اُس کو بنانے کی ضرورت کیا ہے
وہ جو واحد ہے وحیدؔ اُس ہی سے مانگوں میں کچھ
سر کہیں اور جھکانے کی ضرورت کیا ہے
وہ جو روٹھا ہے تو روٹھا ہی رہے ہم سے نازؔ
عمر بھر اُس کو منانے کی ضرورت کیا ہے

غم کا سامان ہو بھی سکتا ہے
ایسا نقصان ہو بھی سکتا ہے
اے میری جان تیرے جانے سے
دل یہ ویران ہو بھی سکتا ہے
آہٹ اُبھری ہے دل کے رستے میں
کوئی مہمان ہو بھی سکتا ہے
عین ممکن ہے وہ نہ لوٹے کبھی
اور امکان ہو بھی سکتا ہے
سوچتا ہوں کہ تیرے جانے سے
دل پریشان ہو بھی سکتا ہے

ساتھ اُس نے نہیں دیا ورنہ
عہد و پیمان ہو بھی سکتا ہے
وہ جو ساتھی تھا نازؔ بچپن کا
اتنا انجان ہو بھی سکتا ہے

بے مزہ ہے زندگی تیرے بغیر
نامکمل ہے خوشی تیرے بغیر
پھیکا پھیکا سا بہاروں کا سماں
سونی سونی ہے ہنسی تیرے بغیر
ہو گیا ویراں میرا صحنِ چمن
لٹ گئی ہے تازگی تیرے بغیر
روٹھے روٹھے سے ہیں نظارے سبھی
سہمی سہمی آنکھ بھی تیرے بغیر
شہر خاموشاں دکھائی دے مجھے
شہر کی ہر اک گلی تیرے بغیر
دیکھ لے تو اے ستمگر دیکھ لے
جی رہا ہوں میں ابھی تیرے بغیر
شہر سارا پوچھتا ہے کون ہو
ہم تو ٹھہرے اجنبی تیرے بغیر
روند ڈالا گردشِ دوراں نے نازؔ
مٹ گئی آسودگی تیرے بغیر

بہت روکا تھا خود کو اُس گلی سے
مگر مجبور تھے دل کی لگی سے
مسافر کر لیا جیون کو ہم نے
تعلق باندھ کر اک اجنبی سے
زمانے کیا بگاڑا ہے تمہارا
ہمیں کیوں دیکھتا ہے برہمی سے
تم ایسا خوبرو دیکھا نہ کوئی
خدا نہ جھوٹ بلوائے کسی سے
وبالِ جان بنتا جا رہا ہے
جسے ہم چاہتے آئے خوشی سے
جسے ہم دلبری سے ناز چاہیں
وہ ملتا ہے ہمیشہ بے رُخی سے

سانس آتی ہے سانس جاتی ہے
زندگی دائرے بناتی ہے
یہ وفا بھی عجیب سمندر ہے
موج در موج آزماتی ہے
ساحلوں سے گزرنے والی ہوا
دل میں اک راستہ بناتی ہے
اب تو یہ رُت جدائیوں والی
چار سو پھیلتی ہی جاتی ہے
نازؔ جس نے سکون لوٹا ہے
یاد اُس کی سدا ستاتی ہے

حکیم سلیم اختر/لاہور

دشت کی خاک وہ سر پر نہیں پڑنے دیتا
اب تو دیوانہ بھی ہشیار ہوا جاتا ہے

اچھی لگتی ہے مجھے اس لیے گھر کی صورت
وہ مرے سامنے رہتا ہے سحر کی صورت
تو مری آنکھوں میں رہتا ہے گلابوں کی طرح
دیکھتا ہوں میں تجھے اہلِ نظر کی صورت
میرے احساس کی دنیا میں اُجالا ہو جائے
دیکھ لوں کاش میں جا کر ترے در کی صورت
بے دھڑک میں تری محفل میں چلا آتا ہوں
نہ کوئی خوف کی صورت ہے نہ ڈر کی صورت
اس کے آنسو نہ ٹھہر پائیں گے رخساروں پر
دیکھ لے وہ جو مرے دیدۂ تر کی صورت
دُھندلا دُھندلا نظر آتا ہے جہانِ رنگیں
اب وہ پہلی سی نہیں شمس و قمر کی صورت
پھول ایثار کے مرجھا نہیں سکتے اختر
خیر کے سامنے چلتی نہیں شر کی صورت

ازل سے ہوا ڈھونڈتی پھر رہی ہے
خدا جانے کیا ڈھونڈتی پھر رہی ہے
خزاں نے یہ کیا رنگ بدلا ہے اپنا
گلوں کو صبا ڈھونڈتی پھر رہی ہے
نظر کو اچانک یہ کیا ہو گیا ہے
ترے نقشِ پا ڈھونڈتی پھر رہی ہے
نظر آ رہی ہے بھنور میں جو کشتی
کوئی ناخدا ڈھونڈتی پھر رہی ہے
میں دانستہ آتا نہیں ہاتھ اُس کے
وہ جانِ ادا ڈھونڈتی پھر رہی ہے
تعاقب میں یوں تو ہزاروں ہیں لیکن
وہ میرا پتہ ڈھونڈتی پھر رہی ہے
عجب دور میں لوگ داخل ہوئے ہیں
حیا کو ردا ڈھونڈتی پھر رہی ہے
کوئی اس کو دیتا نہیں ہے دلاسہ
محبت صلہ ڈھونڈتی پھر رہی ہے
کیا جب سے گھر میں دیا میں نے روشن
میرا گھر ہوا ڈھونڈتی پھر رہی ہے
اُٹھاؤ ذرا ہاتھ تم اپنے اختر
کہ ان کو دعا ڈھونڈتی پھر رہی ہے

چشم بے باک کا دیدار ہوا جاتا ہے
شہر کا شہر ہی ے خوار ہوا جاتا ہے
دشت کی خاک وہ سر پر نہیں پڑنے دیتا
اب تو دیوانہ بھی ہشیار ہوا جاتا ہے
آپ وہی آپ مری سمت چلا آتا ہے
مہرباں سایہ دیوار ہوا جاتا ہے
ہم نے جو حال بنایا تھا ترے عشق میں یار
اب وہی عشق کا معیار ہوا جاتا ہے
ہم ترا عشق چھپائیں تو چھپائیں کیسے
اب زمانہ بھی تو بیدار ہوا جاتا ہے
جس کے شانوں پہ دکھائی نہیں دیتا سر بھی
وہ بھی اب صاحب دستار ہوا جاتا ہے
پھر نئے زخم نئے غم کا طلب گار ہوا
دل ترے نام سے بے زار ہوا جاتا ہے
دشت در دشت پھراتا ہے ترے عاشق کو
عشق بھی جان کا آزار ہوا جاتا ہے
سخت گرمی میں قدم کیسے نکالوں باہر
تم سے ملنا بڑا دشوار ہوا جاتا ہے
اب تو ہر زخم ہے کھلتے ہوئے پھولوں کی طرح
دل کا صحرا گل و گلزار ہوا جاتا ہے
میرا دشمن مرے اندر ہی چھپا ہے اختر
جس سے دل برسرِ پیکار ہوا جاتا ہے

اونچی دستارِ فضیلت نہیں کرتا کوئی
بے حسی ہے یہاں نفرت نہیں کرتا کوئی
بوڑھے برگد کی طرح سوچ ہے انسانوں کی
پیدا افکار میں جدت نہیں کرتا کوئی
کیا سبق تو نے پڑھا رکھا ہے دیوانوں کو
سامنے آنے کی ہمت نہیں کرتا کوئی
خوف کے جال بچھا رکھے ہیں چاروں جانب
اب بیاں اپنی حقیقت نہیں کرتا کوئی
ظلم سے اُس کے پریشان ہیں اس شہر کے لوگ
حد تو یہ ہے کہ بغاوت نہیں کرتا کوئی
ساتھ ظالم کے رہیں یا چلیں مظلوم کے ساتھ
فیصلہ کرنے کی جرات نہیں کرتا کوئی
اس نے کس رکھا ہے لوگوں پہ شکنجہ ایسا
سب ہیں خاموش شکایت نہیں کرتا کوئی
منتشر جن کے خیالات ہوں سوچیں محدود
ایسے لوگوں کی قیادت نہیں کرتا کوئی
ہم ہتھیلی پہ لیے پھرتے ہیں اپنی جانیں
باوجود اس کے محبت نہیں کرتا کوئی
اپنے ہونے کا یقین آتا ہے مجھ کو اختر
جب امانت میں خیانت نہیں کرتا کوئی

شاعری

اپنے من کی مراد پا جاؤ
گھر میں کوئی نہیں ہے آ جاؤ
ظاہری فاصلے مٹا جاؤ
باطنی قربتیں بڑھا جاؤ
دھڑکنیں دھڑکنوں سے ٹکرائیں
آج اتنا قریب آ جاؤ
اپنے لطف و کرم کی خوشبو سے
دل کا آنگن مرا سجا جاؤ
سرد موسم ہے، اپنی قربت سے
دل میں اک آگ سی لگا جاؤ
زندگی دل فریب ہو جائے
دھڑکنوں میں اگر سما جاؤ
ذکر آئے تمہارے ساتھ مرا
ایسی تہمت کوئی لگا جاؤ
تپ رہا ہے وجود کا آنگن
اس میں چھینٹا کوئی لگا جاؤ
دیر تک کچھ نہ مجھ کو ہوش رہے
اتنا بے کل مجھے بنا جاؤ
جانِ راشد! ملن کا موسم ہے
خلوتِ خاص کو سجا جاؤ

ممتاز راشد لاہوری/ لاہور

وہ بھی بپھر رہا تھا روانی کے زور پر
دریا سے لڑ پڑا میں جوانی کے زور پر
کرتو رہے ہیں آگ بجھانے کی کوششیں
جلتی پہ تیل ڈال کے پانی کے زور پر
اُس کا زمانہ گزرے زمانے ہوئے مگر
کردار جی رہا ہے کہانی کے زور پر
سچ کو نحیف ہونٹوں پہ دم توڑنا پڑا
زندہ ہے جھوٹ شعلہ بیانی کے زور پر
سر سرنگوں ہوا ہے سراسر غرور سے
ارزاں ہوا وہ اپنی گرانی کے زور پر
تازہ کیے ہیں ان گنت قصے کہانیاں
دل نے اُس ایک یاد پرانی کے زور پر
مسعود اپنے بیچ جو لفظوں کی جنگ تھی
جیتی ہے اس نے حرف و معانی کے زور پر

مسعود احمد/ اوکاڑہ

یہ میرے دل کے اثاثے ہیں سارے نام ترے
برے دنوں میں یہ آئیں گے جاناں کام ترے
بکاؤ چیز ہے تو اور مصر کا بازار
لگانے والے ہیں تاجر بھی آ کے دام ترے
جو تیری زُلفِ گرہ گیر کے اسیر ہوئے
رہائی مانگتے کب ہیں وہ اب غلام ترے
سلگتی تشنگی پھر بھی بچی ہے ہونٹوں پر
بجا ہے میکدے تیرے چھلکتے جام ترے
یہ اور بات روابط ہیں منقطع اب تو
وہ دن بھی یاد ہیں آتے تھے جب سلام ترے
کئی رتوں سے مسلط ہے یہ عذاب کی رُت
بڑے ہیں مجھ پہ کرم گردشِ مدام ترے
فقیرِ شہر تو جوں توں گزارا کر لے گا
امیرِ شہر نہیں مطمئن عوام ترے
مرے وطن سبھی رہبر ہی بن گئے رہزن
بھٹکتے سجدوں کے وارث ہیں اب امام ترے
جلیل تو بنا پھرتا تھا معتبر کتنا
ہیں پاش پاش وہ سارے خیالِ خام ترے

احمد جلیل/ اوکاڑہ

عجیب دیکھا حساب تیرا
ہیں خار میرے گلاب تیرا
مرا بھی کچھ حق ہے روشنی پر
فقط نہیں آفتاب تیرا
ہوئی ہے سب کی حیات بوجھل
یہی ہے کیا انقلاب تیرا
گئے زمانے ہیں یاد مجھ کو
وہ شوخیاں وہ حجاب تیرا
سکوں کا پل بھی نہیں ہے جس میں
ہے ہجر ایسا عذاب تیرا
غرور اتنا پرائی شے پر
نہیں ہے تیرا شباب تیرا
نظر سے دل تک تھی دُھند شاہد
ہوا تھا جب انتخاب تیرا

ہمایوں پرویز شاہد/ لاہور

عجب طریق پہ ہم آزمائے جاتے ہیں
کہ تیرے خواب دکھا کر ستائے جاتے ہیں
یہ رات دن کا عجب کھیل سا رچا ہوا ہے
کہ دن کو رات کے پیچھے بھگائے جاتے ہیں

یہ کیسے جادو نگر میں ہم آ گئے ہیں جہاں
جو ہم نہیں وہ بنا کر دکھائے جاتے ہیں
کوئی تو ہو کہ شمارے جو حسرتوں کو مری
سب عمر سال، مہینے، بتائے جاتے ہیں
یہ ایک رسم کہن ہے مرے قبیلے میں
کہ دل اُجاڑ کے ہم گھر بسائے جاتے ہیں
وہ خواب گاہ جو خوابوں کی پہلی دشمن تھی
وہیں دھکیل کے پھر سے سلائے جاتے ہیں
ہماری جنگ تو اپنے سے ہی چھڑی ہوئی ہے
کہ ہم تو خود سے جتائے ہرائے جاتے ہیں
نیلم ملک/ لاہور

آنکھیں اپنے بس میں رکھ
یار شرارت ٹھیک نہیں
میری مانو رک جاؤ
اتنی عجلت ٹھیک نہیں
ملنا ہے تو جلدی آ
لمبی مدت ٹھیک نہیں
دیکھ پرندے کہنا مان
پیڑ سے ہجرت ٹھیک نہیں
بات کریں گے فون پہ کل
آج طبیعت ٹھیک نہیں
راؤ وحید اسد/ ملتان

کس کس کی کریں پرسش احوال کہ ہم یاں
ہر شخص کے اُلجھے ہوئے حالات بہت ہیں
اظہار کی فرصت ہی نہیں ملتی وگرنہ
مجھ کو بھی زمانے سے شکایات بہت ہیں
ہر شخص کو جینے کی ہے بھرپور تمنا
ہر دل میں دھڑکتے ہوئے جذبات بہت ہیں
پاکیزہ محبت کے حقائق ہیں بہت کم
شب خون ہوس کی تو روایات بہت ہیں
ٹھرا ہی نہ جاؤں میں کہیں شہر غزل میں
سنتی ہوں وہاں اہل طلسمات بہت ہیں
ڈاکٹر عائشہ عظیم/

نمازِ عشق، محبت وضو کیا ہوا ہے
دعا میں وصل کو جو آرزو کیا ہوا ہے
مری رگوں میں ہے سرعت پزیر وجد کی رو
دھمال رقص کو جس نے لہو کیا ہوا ہے
میں کائنات کے امکان سا بنا ہوں دوست
تری تلاش نے اک جستجو کیا ہوا ہے
یہی خیال تھا کہ میں گردشِ زماں میں ہوں
کھلا کہ اُس نے مجھے چار سو کیا ہوا ہے
اُسی کا لمس میں سانسوں میں بھر رہا ہوں سعید
کلی سے جس کو گل و رنگ بو کیا ہوا ہے
مبشر سعید/ ملتان

فغاں و نالہ و چیخ و پکار کرتے ہوئے
کٹی ہے رات مری غم شمار کرتے ہوئے
اٹھا ہے درد وہ دل بیٹھ بیٹھ جاتا ہے
تمہاری یاد کو اپنا مدار کرتے ہوئے
کسی کا دوش نہیں تھا مرا مقدر تھا
تباہ خود کو کیا میں نے پیار کرتے ہوئے
کوئی بھی لمحہ وہ سوچوں سے محو ہوتی نہیں
کسی کی آنکھ طبیعت خمار کرتے ہوئے
دلا رہا ہے وہ مجھ کو یقیں محبت کا
ستم گری کی ہر اک حد کو پار کرتے ہوئے
چلے تھے جب تو کہا تھا کہیں نہ پہنچو گے
یقیں کو چھوڑ گماں اختیار کرتے ہوئے
نیازت علی نیاز/ مانسہرہ

جب بھی لکھتا ہوں میں غزل صاحب
درد کہتا ہے اب سنبھل صاحب
تیرے چہرے کی یاد آتی ہے
کھلنے لگتا ہے جب کنول صاحب
تجھ کو معلوم ہے کہ جیسے بھی
مسئلے کا نکال حل صاحب
یہ ہوائیں تو کچھ نہ کر پائیں
وقت کا فیصلہ اٹل صاحب
میں ترے ساتھ ہی گزاروں گا
کوئی لمحہ یا کوئی پل صاحب
تم سے آنکھوں سے بات کرنی ہے
آج آؤں کہ یا میں کل صاحب
آ گئے ہو ذرا سا رک جاؤ
دل کی دنیا سے مت نکل صاحب
وہ بضد روکنے پہ ہے اعظم
میں کہوں ساتھ میرے چل صاحب
اعظم سہیل ہارون/ حاصل پور

اتنی حجت ٹھیک نہیں
یار اذیت ٹھیک نہیں
چہرے پر شادابی لا
رونی صورت ٹھیک نہیں

اس دور کی بخشی ہوئی برکات بہت ہیں
افسانے بہت، حرف و حکایات بہت ہیں

کچھ نئے خواب ساتھ ہیں صاحب
جیسے احباب ساتھ ہیں صاحب
کرنے والا ہے دل سفر کوئی
اب کے اسباب ساتھ ہیں صاحب
جب بھی فرصت ملی پڑھوں گا میں
غم کے کچھ باب ساتھ ہیں صاحب
خوبصورت ہیں روز و شب میرے
موسمِ خواب ساتھ ہیں صاحب
سب کو جلدی پڑی ہے جانے کی
سارے بے تاب ساتھ ہیں صاحب
پیاس رہتی ہے دور اب مجھ سے
میرے تالاب ساتھ ہیں صاحب
پاس کچھ بھی نہیں بچا اعظم
ٹوٹے اعصاب ساتھ ہیں صاحب

اعظم سہیل ہارون/ حاصل پور

شوق جب تک صدا نہیں دیتا
وصل دل کو مزا نہیں دیتا
اے ستمگر، یہ تیرا شیوہ ہے
تو تو خود کو سزا نہیں دیتا
چل رہا ہے محبتوں کا سفر
وقت جب تک دغا نہیں دیتا
راحتوں کی طلب پہ زندہ ہوں
غم مجھے کیوں مٹا نہیں دیتا
کیوں شرارہ کسی کی آہوں کا
آشیاں کو جلا نہیں دیتا
کیا ستم ہے کہ کوئی رہبر بھی
منزلوں کا پتہ نہیں دیتا
اے شگفتہ وہ جانِ جاں کیا
جو وفا کا صلہ نہیں دیتا

شگفتہ گل/ لاہور

راہوں میں انتظار کے موتی بکھر گئے
موتی بکھر گئے مجھے بے چین کر گئے
کچھ ایسے مہرباں بھی میسر ہوئے ضرور
دامن چھڑا کے مجھ سے رقیبوں کے گھر گئے
سیلِ بلا کو اہلِ خرد جھانکتے رہے
شوریدگانِ عشق تہوں میں اُتر گئے
عہدِ وفا پہ ناز سے مکر گئے
اے عندلیب! خواہشِ پرواز کیا کرے
شعلوں کے ساتھ ساتھ ترے بال و پر گئے
کچھ پاک دامنی نہ مرے کام آ سکی
بدنامیوں کے داغ محبت کے سر گئے
غنچوں کو کون دے گا پیامِ شگفتگی
بادِ سحر کے جھونکے بھی آ کر گزر گئے
کچھ پاک امنی نہ میرے کام آ سکی
بدنامیوں کے داغ شگفتہ کے سر گئے

شگفتہ گل/ لاہور

نفرت ہے اک طرف تو محبت ہے اک طرف
دوزخ ہے اک طرف تو یہ جنت ہے اک طرف
مل جائیں دونوں ایک جگہ تو کمال ہے
صورت ہے اک طرف تو یہ سیرت اک طرف
آخر تلک جہان تضادات کا شکار
ملنا ہے اک طرف تو قیامت ہے اک طرف
لیکن وہ بے نیاز کبھی دیکھتا نہیں
آنسو ہیں اک طرف مری منت ہے اک طرف
دونوں طرح سے نام کمایا ہے عشق میں
بدنامی اک طرف ہے تو شہرت ہے اک طرف
چلتا ہے زندگی کا نظام اس طرح پیام
مجرم ہے اک طرف تو عدالت ہے اک طرف

محمد اقبال پیام شجاع آبادی/ لاہور

عامر بن علی/ جاپان

کوئی خواہش دبی ہے سینے میں
ورنہ اب کیا مزا ہے جینے میں

اب کے اپریل زخم چھوڑ گیا
پھول کھلتے تھے اس مہینے میں

چند گھڑیاں نشاطِ وصل کی تھیں
زیست کی زہرِ ہجر پینے میں

اک محبت ہی جرم تھا اپنا
عمر گزری ہے زخم سینے میں

عاشقی میں جو مٹ گئے تو کھلا
نشہ ہے خاص اس قرینے میں

....

دشمن نہ سہی دوست مگر اچھے نہیں تھے
وہ لوگ جو مدت سے مرے دل کے مکیں تھے

موسم کے بدلنے سے جو بدلے ہیں وہ ساتھی
کیا جانے کہاں کھو گئے کل تک تو یہیں تھے

شاہی سے نہ تکریم ملے خلق خدا کی
کم ظرف تھے، اکثر جو یہاں تخت نشیں تھے

کب ہاتھ ملا لینے سے دل ملتے ہیں صاحب
ان سے بھی ملے زخم جو ایمان و یقیں تھے

کس دل سے نہ چلیں آج اسی بزم میں عامر
دیکھا ہی نہیں یار نے ہم کل بھی وہیں تھے

سمندر پار سے

لوگ سارے چل پڑے اپنی ضرورت کی طرف
میں کھڑی ہی رہ گئی تنہا محبت کی طرف
شکل وصورت دیکھتے ہیں اور نہ سیرت کی طرف
دنیا والوں کی نظر ہے اب تو دولت کی طرف
خاک کی پوشاک اوڑھے اپنے گھر بیٹھی رہی
میں نے اس عہدِ ہوس میں دیکھا عزت کی طرف
ہر عمل کا اس کے اُوپر ہی فقط ہے انحصار
رب العزت دیکھتے ہیں صرف نیت کی طرف
کیسے کیسے موڑ پر لے آتی ہے انسان کو
دیکھتا رہ جاتا ہے بیچارہ قسمت کی طرف
اونچی شانوں والے میرے رہنما ہیں سعدیہ
ابتدا سے میری نظریں تو ہیں نسبت کی طرف

سعدیہ سیٹھی/برطانیہ

ہم پرندے جو کسی ڈال پہ آ بیٹھتے ہیں
کتنے کم ظرف وہاں جال پہ آ بیٹھتے ہیں
میری نظریں میرے الفاظ مرے شعر تمام
تری آنکھوں پہ کبھی گال پہ آ بیٹھتے ہیں
مجھ سے منسوب ہیں ایسے ترے سارے دکھ سکھ
شام ہوتے ہی میری شال پہ آ بیٹھتے ہیں
اب بھی آتی ہے تیری یاد کہ جیسے شب کو
کہیں جگنو کسی رومال پہ آ بیٹھتے ہیں
کھلکھلانے کے لیے شہر کی اونچی بلڈنگ
کچھ پرندے ہیں جو گھڑیال پہ آ بیٹھتے ہیں
میں ایاز ایسے کسی شہر کا باسی ہوں جہاں
لوگ رشتوں سے الگ مال پہ آ بیٹھتے ہیں

ایاز محمود ایاز/ پیرس

معصوم ہوں سادہ ہوں گناہگار نہیں ہوں
مومن ہوں میں دُنیا کی طلب گار نہیں ہوں
زیور نہ دکھا آج مجھے اپنی دکاں کا
"بازار سے گزری ہوں خریدار نہیں ہوں"
کچھ کچھ میں پریشاں ہوں کچھ کچھ ہوں میں غمگیں
لیکن اے مرے دوست میں بیمار نہیں ہوں
حیدر کی میں للکار ہوں شمشیرِ علی ہوں
دشمن کی میں ٹوٹی ہوئی تلوار نہیں ہوں
ہوں سنگ تراشوں کا تراشا ہوا پتھر
شیشے کی بنی میں کوئی دیوار نہیں ہوں
یا سامنے دنیا کے مجھے اپنا بنا لے
یا آج یہ کہہ دے میں ترا پیار نہیں ہوں
ساحل کی ہوا اور ہوں فرحت بھرا موسم
کشتی کا تری میں کوئی پتوار نہیں ہوں

فرزانہ فرحت/ برطانیہ

زندگی ہے یہاں مہرباں کتنے دن
سر پہ اپنے ہے یہ آسماں کتنے دن
سونا سونا رہے گا مگر کب تک
تنہا تنہا رہے گا مکاں کتنے دن
لب پہ کب تک رہیں گی یہ خاموشیاں
ہم رہیں گے یونہی بے زباں کتنے دن
جانے کب تک رہے گلستاں میں بہار
اور آنگن میں ہے یہ خزاں کتنے دن
اس کی خوشبو تو رسوا کرے گی ضرور
یہ محبت رہے گی نہاں کتنے دن
یہ جو اب مجھ میں لیتے ہیں انگڑائیاں
یہ بھی جذبے رہیں گے جواں کتنے دن
جانے کب تک رہیں گے یہ ساحل یونہی
ہے سمندر کی ان کو اماں کتنے دن

ارشد نذیر ساحل/ اسپین

کبھی تنہا سفر ہوتا نہیں ہے
سفر ہوتا ہے پر ہوتا نہیں ہے
خدا نے خوبیاں رکھی ہیں سب میں
کوئی بھی بے ہنر ہوتا نہیں ہے
ہمیشہ خود غرض ہوتا ہے انساں
کبھی کوئی شجر ہوتا نہیں ہے
بناتا ہوں بہت منصوبے لیکن
کوئی بھی کارگر ہوتا نہیں ہے
یہی سچ ہے اگر سچا ہو کوئی
کسی کا اس کو ڈر ہوتا نہیں ہے
ظفر اک دل میں رہنے والا بندہ
کبھی بھی دربدر ہوتا نہیں ہے

ظفر اعوان/ ڈنمارک

مختصر ادبی خبریں

✦ شاعر و ادیب پروفیسر ڈاکٹر زرتاج ہاشمی اچانک حرکت قلب بند ہونے سے انتقال فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات بلند کرے اور لواحقین کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔

✦ ممتاز ادیب تفاخر محمود گوندل کے والد گرامی طویل علالت کے بعد گزشتہ دنوں خالق حقیقی سے جے ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات بلند کرے اور لواحقین کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔

✦ پنجابی کہانی کار شاور چدھڑ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات بلند کرے اور لواحقین کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔

✦ مظفر ظفر عظمی صاحب انتقال فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات بلند کرے اور لواحقین کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔

✦ پاکستانی صحافت کا ایک اور ستارا ڈوب گیا۔ قومی اخبار کے ایڈیٹر ان چیف الیاس شاکر صاحب انتقال کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات بلند کرے اور لواحقین کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔

✦ ایف ایم 95 کے نوجوان پریذینٹر رانا زی کرنٹ لگنے سے زندگی کی بازی ہار گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات بلند کرے اور لواحقین کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔

✦ پاکستان کے نامور شاعر دوستوں جیسے بزرگ اقبال ارشد بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات بلند کرے اور لواحقین کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔

✦ سعودی عرب ریاض میں مقیم ڈاکٹر شفیق ندوی بھی انتقال فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات بلند کرے اور لواحقین کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔

✦ معروف شاعر اور عظیم فلمکار سلیم کوثر ان دنوں شدید علیل ہیں۔ احباب سے دعا کی درخواست ہے۔

✦ قیس قیصرانی ایک ایکسیڈنٹ میں شدید زخمی ہو گئے۔ ارژنگ ٹیم صحت یابی کے لیے دعا گو ہے۔

✦ اورینٹل کالج شعبہ کالج کے اُستاد سعادت علی ثاقب کی والدہ محترمہ انتقال فرما گئیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات بلند کرے اور لواحقین کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔

✦ بھارت اور پاکستان میں امن کے بہت بڑے پیامبر اور آزادی کی تقریب پر ہر سال دیے جلانے والے عظیم صحافی اور دانش ور کلدیپ نائر اس دنیا سے رُخصت ہو گئے۔

✦ ٹوبہ ٹیک سنگھ کے مشہور بزرگ نعت خواں حافظ بشیر عثمانی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات بلند کرے اور لواحقین کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔

✦ مشہور شاعر علی فرل انتقال فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات بلند کرے اور لواحقین کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔

✦ اُردو ادب کا فخر فہمیدہ ریاض سخت علیل ہیں۔ احباب سے دعا کی درخواست ہے۔

✦ معروف شاعر اکرام الحق شوق انتقال فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات بلند کرے اور لواحقین کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔

✦ جمیل احمد پال محکمہ تعلیم سے ریٹائر ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات بلند کرے اور لواحقین کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔

✦ ڈاکٹر کیول دھیر کو نیشنل ایوارڈ برائے ہندی ادب سے نوازا گیا۔

✦ مسعود ندیم ان دنوں علیل ہیں۔ احباب سے دُعا کی درخواست ہے۔

✦ مجلس ترقی ادب کے چیئرمین تحسین فراقی کے بیٹے کا انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات بلند کرے اور لواحقین کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔

✦ سڈنی کی میلوڈی آواز سید ریاض شاہ اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات بلند کرے اور لواحقین کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔

✦ بڑے شاعر اور ٹی وی پروڈیوسر سلمان سعید اللہ کو پیارے ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات بلند کرے اور لواحقین کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔

✦ پروفیسر سلیم احمد صدیقی وفات پا گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات بلند کرے اور لواحقین کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔

✦ نیویارک کے ساتویں سالانہ انٹرنیشنل مشاعرہ میں حمیدہ شاہین نے شرکت کی۔

✦ پروفیسر یوسف حسن بھی انتقال فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات بلند کرے اور لواحقین کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔

تبصرۂ کتب/فلیپ/آراء

نام کتاب: یہ باتیں تری یہ فسانے ترے/انٹرویوز: بشریٰ رحمٰن/صفحات:584 / قیمت: 2000/فلیپ: حسن عباسی

ناشر: نستعلیق پبلی کیشنز، فیروز سنٹر غزنی اسٹریٹ اُردو بازار، لاہور0300-4489310

بشریٰ رحمٰن کا نام سیاسی، سماجی، ادبی اور صحافتی حوالے سے کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ادبی حوالے سے وہ اُردو زبان کی نہایت منفرد اور نامور ناول نگار، ہر دلعزیز افسانہ نویس، سفرنامہ نگار، ڈرامہ رائٹر، کالم نویس، شاعرہ اور شعلہ بیان خطیبہ ہیں۔دنیا میں جہاں جہاں اردو کی بستیاں آباد ہیں وہاں وہاں بشریٰ رحمٰن کا نام اور تخلیقی کام پہنچ چکا ہے۔اُن کے اب تک 9 ناول، آٹھ ناولٹ، چھ افسانوں کے مجموعے، آٹھ سفرنامے، تین فی البدیہ تقاریر کی کتب اور چار کالموں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ان کے تخلیقی کام کو ادبی اور عوامی حلقوں میں بھرپور پذیرائی ملی اور اُردو ادب کے نامور مشاہیر نے ان کے کام کو سراہا، بلکہ خوب صورت الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا۔بشریٰ رحمٰن نے 27 سے زائد ممالک میں پاکستان کی نمائندگی کی۔زیرِ نظر مجموعہ ''یہ باتیں تیری یہ فسانے تیرے'' اُن کے قومی و بین الاقوامی انٹرویوز پر مشتمل ہے۔اس حوالے سے وہ اُردو کی واحد ادیبہ ہیں جن کے انٹرویوز کتابی شکل میں شائع ہوئے ہیں ورنہ اس سے قبل مختلف شخصیات کے انٹرویوز پر مشتمل کتب شائع ہونے کی روایت رہی ہے۔بشریٰ رحمٰن تین مرتبہ صوبائی اسمبلی پنجاب کی رُکن رہی ہیں۔1998ء میں صوبائی اسمبلی پنجاب کے صد سالہ اجلاس میں بشریٰ رحمٰن کی کارکردگی پر انہیں بہترین پارلیمنٹرین کا گولڈ میڈل دیا گیا۔یہ گولڈ میڈل سابق وزیراعظم محمد خاں جونیجو نے دیا۔1990 میں صوبائی اسمبلی پنجاب نے انہیں ''بلبل پاکستان'' کے خطاب سے بھی نوازا۔وہ 2002ء اور 2008ء میں قومی اسمبلی کی رکن منتخب ہوئیں۔بشریٰ رحمٰن پاکستان کی پہلی کالم نگار خاتون ہونے کا اعزاز بھی رکھتی ہیں۔پاکستان میں اُن کی تمام کتب Best Seller ہیں اور ہمسایہ ملک میں ان کی تمام کتب ہندی اور دوسری علاقائی زبانوں میں چھپ رہی ہیں اور کافی مقبول ہیں۔

بشریٰ رحمٰن کردار و گفتار کی غازیہ ہیں۔اُن کی شخصیت اور تحریروں میں ایک خاص طرح کا تقدس اور نورانیت پائی جاتی ہے جو ہمیں صوفیا کے ہاں ملتی ہے۔وہ ادبی دنیا میں ایک نیا موسم لے کر داخل ہوئیں اور رفتہ رفتہ ہم سب اس موسم میں رہنے لگے۔خواتین کی دو نسلوں نے ان کی تحریریں پڑھ کر لکھنا سیکھا۔انہوں نے اُردو ادب کی بہت سی اصناف کو گھر کی چیزوں کی طرح سنوارا اور نکھارا ہے۔گھریلو زندگی ہو یا ادبی دنیا وہ دونوں میں سرخرو ہوئی ہیں۔انہوں نے سلیقگی شائستگی، شگفتگی اور اپنی ہنرمندی سے ان دونوں انتہاؤں کو اعتبار بخشا ہے۔چادر، چار دیواری اور چاندنی اُن کے کالم کا مستقل عنوان ہی نہیں بلکہ ان کی زندگی کا منشور بھی ہے جسے وہ دوپٹے کی طرح ہر وقت اپنے سر پر اوڑھے رکھتی ہیں۔وہ زندگی کا گہرا شعور اور ادراک رکھتی ہیں۔وہ زندگی اور ادب سے متعلق لگے بندھے اصولوں کو آنکھیں بند کر کے ماننے کی بجائے اپنی سوچ اور معیار کی کسوٹی پر پرکھ کے قبول یا رد کرتی ہیں۔اس لیے وہ تحریر اور تجربہ ان کی ذات کی مکمل سچائی بن کر نمودار ہوتا ہے۔ان کی کتابوں میں لفظوں کا خالص سونا بکھرا پڑا ہے جس میں ایک فیصد بھی کھوٹ شامل نہیں۔اس لیے قاری نے ہمیشہ اُن کی ہر نئی کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیا ہے۔اُمید ہے بشریٰ رحمٰن کے انٹرویوز کی یہ کتاب بھی غیر معمولی پذیرائی حاصل کرے گی۔میرے ادارے کے لیے اس کی اشاعت اور اہتمام کسی اعزاز سے کم نہیں۔

نام کتاب: بھانبڑ وچ سریر/شاعر: انجینئر ظفر محی الدین/صفحات:208 / قیمت: 400/فلیپ: حسن عباسی

ناشر: نستعلیق پبلی کیشنز، فیروز سنٹر غزنی اسٹریٹ اُردو بازار، لاہور0300-4489310

ظفر محی الدین کی شاعری میں ایک کسک ہے۔ایک نامکمل اظہار کا دکھ ہے۔ان کی ذات کے اندر مسلسل توڑ پھوڑ کا عمل جاری رہتا ہے۔وہ خود کو جتنا سمیٹتے ہیں اُس سے کہیں زیادہ بکھر جاتے ہیں۔اپنے اندر کا زہر کاغذ پر اُتار کے بھی اُن کا وجود ہلکا نہیں ہوتا۔ان کے آنسوؤں کے اندر گرتے ہیں جس سے ان کی طبیعت اور بوجھل ہو جاتی ہے۔وہ اگرچہ صوفیاء کے سلسلے سے تعلق رکھتے ہیں مگر پھر بھی اُن کے اندر کی بے چینی اور کرب انہیں مسلسل اضطراب میں رکھتا ہے۔یہی اضطراب کی کیفیت ہمیں مسلسل

کائنات میں دکھائی دیتی ہے۔ یوں لگتا ہے انجینئر ظفر محی الدین کے اندر کائنات سمٹ آئی ہے یا پھر وہ اس کائنات میں ہر لحہ بکھر رہے ہیں۔ ان کی شاعری کے اندر ان کی ذات کے عکس نمایاں ہیں۔ اُن کی نظم ایک پیغام ہے۔ جس سے نہ صرف قاری حظ اُٹھاتا ہے بلکہ سوچنے پر مجبور بھی ہوتا ہے۔ یہی کسی تخلیق کار کا کمال ہوتا ہے کہ وہ قاری کی سوچ کا رُخ بدلے اور ظفر محی الدین اس پر قادر نظر آتے ہیں۔

نام کتاب: لاموجود/ شاعر: آصف نظیر/ صفحات: 168/ قیمت: 400/ فلیپ: پروفیسر معین نظامی

ناشر: نستعلیق پبلی کیشنز، فیروز سنٹر غزنی اسٹریٹ اُردو بازار، لاہور 0300-4489310

آصف نظیر کے مجموعۂ کلام ''لاموجود'' کی شاعری مختلف رنگ اور جداگانہ ذائقے کی شاعری ہے۔ حُسنِ الفاظ کے پیرہن میں شدتِ احساس جلوہ گر ہے۔ ایقان و عرفان کی تہ داری اور سرشاری سے تشکیل پانے والی یہ شاعری راحتِ قلب ونظر کا سامان بھی ہے اور تسکینِ شعور وفکر کا سرمایہ بھی۔ شاعر کی وجدانی کیفیات میں وفور بھی ہے اور مستی ورعنائی بھی۔ وہ دل کی بات کہنے کا ہنر جانتے ہیں۔ لفظ و معنی کے آداب داں ہیں اور اہمیتِ ابلاغ کے دقیقہ شناس۔ ان کی شاعری میں موجود دینی وصوفیانہ تلمیحات ان کے کمالِ ہنر کی دلنشیں شہادتیں ہیں۔ ان کی بعض نوآورانہ ردیفیں دامنِ دل کھینچتی ہیں اور کچھ لطف انگیز تراکیب شیرینیِ کلام بڑھاتی ہیں۔ یہ مجموعۂ کلام دشتِ حیات و کائنات میں شاعر کی جریدہ روی کی سرگذشت ہے اور اس طلسماتِ تنہائی میں بہت سے عجائب وغرائب جھلک دکھاتے ہیں۔ ماورائی علوم وفنون سے شغف اور ان میں ممارست کے شواہد اِس شاعری میں جابجا نظر آتے ہیں اور کیفِ سخن میں اضافے کا سبب بنتے ہیں۔ صاحبِ مطالعہ شاعر اگر خوش قسمتی سے اپنا حاصلِ مطالعہ تخلیقی ہنرمندی سے جزوِ شعر بنانے میں کامیاب ہوجائے تو وہ شاعری ایسی ہی مختلف ہوتی ہے جیسی اس مجموعے کی شاعری۔ اِس مجموعے میں فارسی کے عظیم صوفی شاعر خواجہ فریدالدین عطار نیشاپوری کے ایک معرکہ آرا قصیدے کی بہت کامیاب منظوم ترجمانی کی گئی ہے جسے تخلیقِ مکرر کہنا چاہیے، یہ ترجمانی بجائے خود خاصے کی چیز ہے۔ آصف نظیر کو اس مجموعے کی اشاعت مبارک ہو۔ یقیناً یہ سفینۂ سخن شایانِ شان داد وتحسین حاصل کرنے میں کامیاب رہے گا کیوں کہ اس میں سراہے جانے کے قابل بہت کچھ ہے۔

نام کتاب: یادوں کے جزیرے/ سفرنامہ نگار: فقیر اللہ خان/ صفحات: 144/ قیمت: 400/ رائے: حسن عباسی

ناشر: نستعلیق پبلی کیشنز، فیروز سنٹر غزنی اسٹریٹ اُردو بازار، لاہور 0300-4489310

فقیر اللہ خاں کی لکھی ہوئی مختلف موضوعات پر کتب میں نے پڑھی ہیں۔ بنیادی طور پر تو وہ سفرنامہ نگار ہیں لیکن تحقیق بھی اُن کا محبوب موضوع ہے۔ فسیروفی الارض کی آیت پر عمل پیرا ہو کر انھوں نے دنیا کی سیر کی ہے۔ مختلف ملکوں اور قوموں کی تاریخ، تہذیب اور کلچر کا مشاہدہ کیا ہے۔ مگر یہ مشاہدہ انھوں نے بند آنکھوں سے نہیں بلکہ کھلی آنکھوں سے کیا ہے جسے ''چشم بینا'' کہتے ہیں۔ وہ جہاں بھی گئے ہیں وہاں سے سرسری نہیں گزرے۔ بلکہ جہانِ دیگر کا مطالعہ بھی کیا ہے اور میر کی نصیحت پہ عمل کرتے ہوئے اس سے سبق بھی حاصل کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اسفار انہیں خدا اور رسولؐ کے مزید قریب لائے۔ قدرت ان پر مہربان ہوئی اور انہوں نے ''المکہ'' اور ''المدینہ'' جیسی دو شہکار کتب لکھیں اور دنیا وآخرت میں اپنے لیے خیر کا سامان مہیا کر لیا۔ ''دنیا کی خوبصورت مساجد'' بھی اُن کی نہایت منفرد اور معلوماتی کتاب ہے اور یہ سلسلہ ابھی جاری وساری ہے۔

فقیر اللہ خاں ایک سیاح اور درویش منش صوفی ہیں۔ ان کے اندر تجسس کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ دورانِ سفر وہ ہر منظر کو چشمِ حیرت سے دیکھتے ہیں۔ صاحبِ مطالعہ ہیں اور ہر چیز سے متعلق اپنا ایک خاص نکتہ نظر رکھتے ہیں اس لیے ان کے سفرنامے ہوں یا دینی کتب وہ نہایت منفرد اور معلوماتی ہوتی ہیں۔ قاری کے لیے اُن سے سیکھنے کے لیے بہت کچھ ہوتا ہے۔ وہ جس موضوع کا انتخاب کرتے ہیں اُس کا حق ادا کرتے ہیں اس لیے اُن کی کتب کی ڈیمانڈ ہے اور وہ ہاتھوں ہاتھ لی جاتی ہیں۔ زیرِ نظر کتاب ''یادوں کے جزیرے'' اُن کے آبائی شہر سے لے کر امریکہ تک کا سفرنامہ ہے جسے آپ بیتی بھی کہا جاسکتا ہے۔ کیونکہ اس میں انہوں نے اپنی زندگی کے کئی باب بھی وا کیے ہیں۔ بچپن، لڑکپن اور جوانی کی خوب صورت یادوں کے ساتھ ساتھ امریکہ کے سفر اور قیام کی روداد کو بھی نہایت خوب صورت انداز میں سپردِ قرطاس کیا ہے۔ امریکہ سے متعلق بہت سی ایسی معلومات بھی فراہم کی ہیں جو اس سے پہلے ہمیں اس طرح کسی ایک کتاب میں پڑھنے کو نہیں ملتیں۔ فقیر اللہ خاں ایک سچے، کھرے، مخلص اور سادہ انسان ہیں۔ اُن کی اپنے کام سے لگن اور کمٹمنٹ نے ہمیشہ مجھے متاثر کیا ہے۔ مجھے ہر بار ان سے مل کر خوشی ہوتی ہے۔ کیونکہ مجھے ہر بار اُن سے زندگی سے متعلق کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔ میں اُن کی مزید کامیابیوں کے لیے دعا گو ہوں۔

نامہ ہائے احباب

پیارے بیٹے عامر بن علی و مدیر حسن عباسی
سلامت رہو!

بہت محبت بہت خلوص اور ہزاروں دعاؤں کے ساتھ ماہنامہ ارژنگ کے لیے 2018 کے تازہ شعری مجموعہ کلام جو صرف حمد و نعت اور سلام پر مشتمل ہے۔

پیار و دعوات! 2018ء میں ''بیاضِ نظر'' نعتیہ شعری مجموعہ کلام جمہوری پبلی کیشنز 2 ایوانِ تجارت روڈ لاہور پریس کی نذر ہو چکا ہے۔ یہ میرا پانچواں مجموعہ کلام ہے اور پہلا جو حمد و نعت و سلام پر مشتمل ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہے۔ ارض و سما و غیب کا علم اُسی کے پاس ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی کائنات کے تخلیق کار ہیں۔ اُس کی ذات والا صفات نہ ہمارے فہم و ادراک میں آسکتی ہے۔ نہ بصیرت اُس تک پہنچ سکتی ہے، جس ہستی کو درود و سلام کے تحائف خود ربّ العزت کی ذات اور فرشتے پیش کریں ان کی توصیف و تعریف انسان کے بس میں کہاں؟ اس کائنات کی فرحت و شادمانی محض اُسی کا کمال ہے اور وجہ کائنات حضرت محمد ﷺ کی ذاتِ والا صفات کا ذکر قلب و روح کی طمانیت ہے۔ میرا مادیت سے روحانیت کا یہ سفر حضور خیر الانام ﷺ کی نعت سے شروع ہوتا ہے۔ خاص طور پر ہر مسلمان عاشقِ رسول تب بنتا ہے جب محبت اور عقیدت کے اس سفر میں کوچۂ رسول کے غلاموں کی فہرست میں شامل ہو جائے۔ اس سفر میں شرط ایمان بدرجہ اتم موجود ہوتی ہے۔ سفرِ طیبہ کی یہ سعادت مجھے 19 دسمبر 2006ء تا 8 جنوری 2007ء میں نصیب ہوئی۔ یہ حج اکبر میرے سب سے چھوٹے بیٹے فواد احمد اور مولانا طارق جمیل کی معاونت میں نصیب ہوا۔

زندگی کا انعام اور بخشش نعت کہنے سے مربوط ہے۔ نعت کہنا، نعت سننا، نعت گنگنانا، نعت سرائی کارِ خیر بھی ہے اور کارِ ثواب بھی۔ نعت پاک کا ہر حرف مسلمان کے ایمان کو تقویت بخشتا ہے۔ میں نے بھی کشکولِ سخن کو توشہ نعت سے آراستہ کیا ہے۔ خدا تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہی میرے لیے کشکولِ نجات اور توشہ آخرت بن جائے۔ آمین

حضور کا ذکر اور سلام اور درودوں اور نعتوں کا وقار بلند ہوتا ہے۔ طیبہ کی حاضری کے حوالے سے جب عقیدتوں کا قبلہ و کعبہ قریب ہوتا ہوا محسوس ہوا اس طرح جذبوں کی لو تیز تر ہوتی چلی گئی اور آقا سے رشتہ آقا اور غلام کے ناطے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوتی چلی گئیں۔ اسی حوالے سے درِ آقا پہ اشعار نازل ہوئے۔

کیونکہ آنسو عقیدت و محبت کا چھلکتا ہوا جام ہیں۔

درِ رسولؐ پہ رو رو کے جو کٹے لبنیٰ
وہ لمحہ قیمتی ہے عمر بھر کے جینے سے
سجا لیا ہے بہت زیست کو قرینے سے
مری نگاہ کا ہے رابطہ مدینے سے

اللہ کرے میرا ہر مصرعہ ذوق، ہر قافیہ پر کیف، ہر ردیف عقیدت سرور میں ڈوبا ہوا یہ کلام میری بخشش کا وسیلہ بن جائے۔ میرا کلام ''بیاضِ نظر'' نعت کے وقار میں اضافے کا باعث ہو۔ میرا یہ ہدیۂ نعت قبول و منظور ہو جائے۔

لبنیٰ عطائے خاص شفاعت ہو روزِ حشر
دلِ میں بسی ہوئی ہے محبت حضور کی

لبنیٰ صابری، ساہی وال

جنابِ حسن عباسی صاحب!

سلام مسنون! بہت دیر کے بعد حاضری دے رہا ہوں۔ ''ارژنگ'' باقاعدگی سے مل رہا ہے۔ آپ کی ادارت میں اس ادبی مجلے نے جو ادبی خدمات سرانجام دی ہیں۔ وہ قابلِ صد استحسان ہیں، آپ کی خدمات کا اعتراف اگر یوں کروں تو بے جا نہ ہوگا۔

ادب کی آبیاری کر رہے ہو
ادب تم پر سدا نازاں رہے گا

اور دعا یہ بھی ہے ع اللہ کرے زورِ جنوں اور زیادہ

اپنی اور مسعود احمد کی کچھ تخلیقات برائے ''ارژنگ'' ارسال کر رہا ہوں۔

دعا گو احمد جلیل

محترم جناب عامر بن علی!

اسلام علیکم۔ اُمید ہے خیریت سے ہوں گے۔ ماہنامہ ''ارژنگ'' جب بھی ملتا ہے آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کا ہر بار انتہائی منفرد ٹائٹل جو کہ عموماً موسموں یا تہواروں کی مناسبت سے ہوتا ہے آنکھوں کو بھلا لگتا ہے۔ ماہنامہ ''ارژنگ'' ۱۹ برس سے باقاعدگی سے آپ شائع کر رہے ہیں۔ بلاشبہ یہ علم و ادب کی بڑی خدمت ہے۔ فی زمانہ یہ گھاٹے کا سودا ہے مگر آپ جیسے ادب پرور لوگوں کو دیکھ کر خوشی ہوتی ہے۔ آپ صحیح معنوں میں ''ہیرو'' ہیں۔ ''ارژنگ'' کے تمام سلسلے بہت اچھے ہیں۔ خاص کر شاعری کا سلسلہ کہ اس میں ہمارے جیسے شعراء بھی باقاعدگی سے شائع ہوتے ہیں۔ پاکستان میں دیگر ادبی رسائل پر ایک مخصوص شعراء کے گروہ کی چھاپ نظر آتی ہے مگر ''ارژنگ'' اس حوالے سے داد و تحسین کا مستحق ہے کہ اس میں بلا تفریق اور بغیر کسی گروہ بندی کے کراچی سے کشمیر اور خیبر تک اور بیرونِ ملک شاعروں کی بھی بھرپور نمائندگی ہوتی ہے۔ اس ضمن میں حسن عباسی کی کوششیں بھی صد لائقِ تحسین ہیں جو کہ اسے سجانے اور سنوارنے میں کوئی کسر باقی نہیں رہنے دیتے۔ ایک بار پھر ''ارژنگ'' کی پوری ٹیم کو دل کی گہرائیوں سے اس کی مسلسل اشاعت پر مبارک باد

محمد اقبال پیام شجاع آبادی، لاہور

وہ موسیقی جو ذہن کو سکون اور روح کو راحت دے۔ وہ واقعی روح کی غذا ہے۔

نامور گلوکار، صحافی اور ادیب ڈاکٹر امجد پرویز سے لبنیٰ صفدر کی گفتگو

ارژنگ: آپ کی پیدائش کہاں ہوئی، تعلیم کہاں کہاں سے حاصل کی؟

ج: میری پیدائش لاہور میں ہوئی۔ میرے والد پروفیسر شیخ عبدالکریم مرحوم جن کا تعلق سیالکوٹ سے تھا، میٹرک کے بعد لاہور منتقل ہو گئے تھے اور بقیہ تعلیم اسلامیہ کالج لاہور سے حاصل کی۔ ایم ایس سی کیمسٹری کے بعد وہیں درس و تدریس سے منسلک ہو گئے۔ اپنی وفات کے وقت وہ صدر شعبہ کیمیا تھے۔ ان کی کتب کریمز کیمسٹری، کریمز آرگینک کیمسٹری، کریمز ان آرگینک کیمسٹری اور کریمز پریکٹیکل کیمسٹری سے ہندوؤں اور مسلمانوں نے بیک وقت استفادہ کیا۔

ارژنگ: آپ بالحاظ تعلیم انجینئر ہیں۔ صحافت سے منسلک ہیں اور کلاسیکل گائیک بھی ہیں۔ اس سفر میں کس شعبے میں زیادہ دلچسپی ہے؟

ج: میں نے لاہور اسکولز میں 1960ء میں اول اور سنٹرل ماڈل سکول لاہور میں بھی اول پوزیشن حاصل کی تھی۔ موسیقی سے شغف قدرتی تھا۔ سکول کے بزم

ہمارا پاپ میوزک، ہماری لوک اور ہلکی پھلکی موسیقی میں موجود ہے۔

([illegible])

نامور صحافی یاسر پیرزادہ کا اہل قلم کے اعزاز میں عید ملن عشائیہ

عطاء الحق قاسمی، مجیب الرحمٰن شامی، عامر بن علی اور یاسر پیرزادہ محو گفتگو ہیں

وجاہت مسعود، اجمل شاہ دین اور علی عثمان قاسمی بھی شریک محفل تھے

گل نوخیز اختر اور یاسر پیرزادہ۔ عہد حاضر کے دو خوبصورت کالم نگار

ناصر محمود ملک اور ساتھی دانشور کا انہماک

اکادمی ادبیات پاکستان کے زیر اہتمام سفینہ سلیم کے اعزاز میں ایک شام

صدارت : کرامت بخاری | مہمانِ خصوصی : عامر بن علی | اہتمام : ممتاز راشد لاہوری

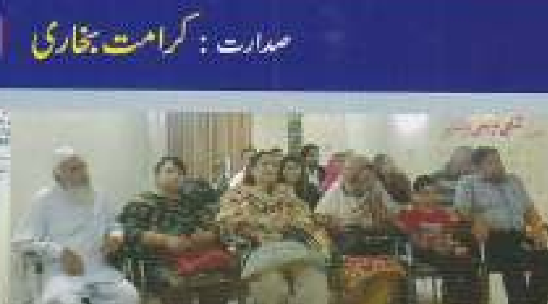

تقریب میں لاہور کے اہم ادباء اور شعراء نے شرکت فرمائی

Design By: 0336-4826821
MUHAMMAD AHSAN Gull

Read Arxang online
www.amirbinali.com
www.millat.com